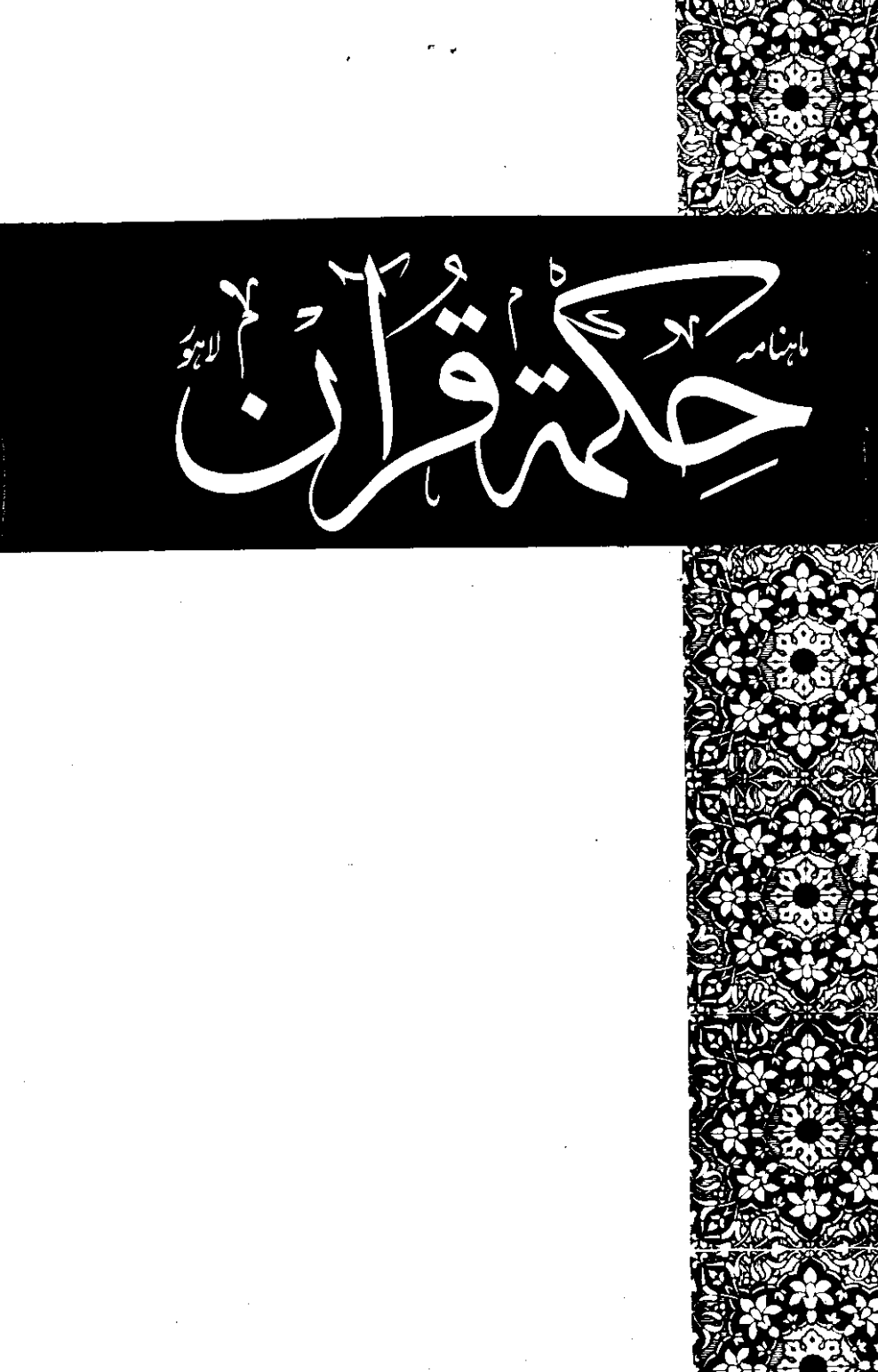

ماہنامہ

حکمتِ قرآن

لاہور

فہمِ قرآن

اور

خصوصاً قرآن کے منضبط اور مربوط مطالعہ کے ضمن میں ——

ڈاکٹر اسرار احمد

کی نشری (ریڈیو) تقاریر پر مبنی ایک اہم تصنیف

قرآن مجید کی سورتوں کا اجمالی تجزیہ

(سورہ الفاتحہ تا سورہ الکہف)

ضرور مطالعہ کیجیے

◎

اعلیٰ سفید کاغذ ○ عمدہ کتابت ○ دیدہ زیب طباعت

ہدیہ : ۱۰ روپے

وَمَنْ يُّؤْتَ الْحِكْمَةَ فَقَدْ اُوْتِيَ خَيْرًا كَثِيْرًا

(البقرة: ۲۶۹)

ماهنامه

حکمتِ قرآن

لاهور

جاری کردہ: ڈاکٹر محمد رفیع الدین ایم اے، پی ایچ ڈی، ڈی لٹ، مرحوم

مدیر اعزازی: ڈاکٹر ابصار احمد ایم اے، ایم فل، پی ایچ ڈی،

معاون مدیر: حافظ عاکف سعید، ایم اے (فلسفہ)

شمارہ ۱	جنوری ۱۹۸۷ء مطابق جمادی الاولیٰ ۱۴۰۷ھ	جلد ۶

— یکے از مطبوعات —

مرکزی انجمن خدام القرآن لاهور

۳۶ - کے۔ ماڈل ٹاؤن - لاهور ۱۴

فون: ۸۵۲۶۱۱

کراچی آفس: ۱۱ داؤد منزل متصل شاہ بکری۔ شاہراہ لیاقت۔ کراچی (فون: ۲۱۶۵۱۶)

سالانہ زرِ تعاون -/۴۰ روپے —————— فی شمارہ -/۴ روپے

مطبع: آفتاب عالم پریس ہسپتال روڈ لاہور

فہرس

حرفِ اوّل ——— ۳

عاکف سعید

حِکَم و عِبَر ——— ۵

ڈاکٹر ابصار احمد

ہدایت القرآن ——— ۱۲

مولانا محمد تقی امینی

دعوت رجوع الی القرآن کا منظر و پس منظر (۱) ——— ۱۵

قرآنِ حکیم قرنِ اوّل میں اور اس کے بعد

ڈاکٹر اسرار احمد

حکمتِ اقبال (۱) ——— ۳۳

حکمتِ اقبال پر ایک عمومی نظر

ڈاکٹر محمد رفیع الدّین

نقد و نظر ——— ۴۸

غلبۂ حال اور انبیاء کرام علیہم السلام

مولانا اخلاق حسین قاسمی

قرآن مجید اور ۱۹ کا عدد ——— ۵۱

مولانا عبدالقدوس ہاشمی

THE GREAT BRAIN ROBBERY ——— ۷۲

THEORY OF 19 - A GREAT HOAX

BY. ARFAQUE MALIK

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

حرفِ اوّل

اللہ تعالےٰ کی تائید و توفیق سے ہم حکمتِ قرآن کی چھٹی جلد کا پہلا شمارہ پیش کر رہے ہیں۔ فللہ الحمد و المنہ۔

حکمتِ قرآن کے زیرِ نظر شمارے سے ہم، حسبِ اعلان، ڈاکٹر محمد رفیع الدّین مرحوم و مغفور کی بلند پایہ علمی تصنیف 'حکمتِ اقبال' کی قسط وار اشاعت کا آغاز کر رہے ہیں۔ جیسا کہ نومبر ۸۶ء کے شمارے میں ذکر کیا جا چکا ہے، مرحوم کی یہ کتاب ایک عرصے سے نایاب تھی۔ ایک سال قبل جب محترم ڈاکٹر اسرار احمد صاحب ابوظبی جانا ہوا تو وہاں ڈاکٹر محمد رفیع الدّین مرحوم کے سب سے چھوٹے صاحبزادے جناب شجاع الدّین نے ایک ملاقات میں انہیں 'حکمتِ اقبال' کا وہ نسخہ بطور ہدیہ دیا تھا جس پر خود ڈاکٹر صاحب مرحوم نے نظرِ ثانی فرما کر اپنے قلم سے اصلاح و تصحیح اور حک و اضافہ کیا تھا۔ ڈاکٹر اسرار احمد صاحب نے یہ وعدہ کیا تھا کہ وہ اس نادر علمی کتاب کو اپنے ادارہ کے زیرِ اہتمام شائع کریں گے۔ (اس معاملے میں پوری تفصیل نومبر ۸۶ء کے 'حکمتِ قرآن' میں شائع ہو چکی ہے) اس کتاب کو ابتداءً 'حکمتِ قرآن' میں قسط وار شائع کیا جائے گا اور مکمل ہونے پر کتابی شکل دے دی جائے گی ـــــ ڈاکٹر رفیع الدّین مرحوم ہی کی ایک اور وقیع علمی کتاب 'منشورِ اسلام' جو انگریزی زبان میں تحریر کی گئی تھی، کے بارے میں بھی یہ فیصلہ کیا گیا تھا کہ اسے 'حکمتِ قرآن' میں بزبانِ اردو شائع کیا جائے گا۔ اس کتاب کی سلسلہ وار اشاعت کا آغاز ان شاء اللہ اگلے ماہ سے ہو جائیگا۔

'حکمتِ قرآن' جس قرآنی تحریک اور دعوت 'رجوع الی القرآن' کا علمبردار ہے اُس کے فکری اور تاریخی پس منظر کی وضاحت کے سلسلے میں محترم ڈاکٹر اسرار احمد صاحب کے جو نہایت قیمتی مضامین ۷۵ـ۷۶ء کے میثاق میں شائع ہوئے تھے اور پھر انہیں یکجا 'حکمتِ قرآن' کے جولائی ۸۲ء کے شمارے میں شائع کیا گیا تھا، حسبِ اعلان نہ صرف یہ کہ انہیں کتابی شکل میں شائع کرنے کے لئے اُن کی اعلیٰ معیار پر کتابت کا اہتمام کیا جا رہا ہے بلکہ 'حکمتِ قرآن'

کے نئے دَور کے آغاز کی مناسبت سے اسی شمارے سے ان کی قسط وار اشاعت کا آغاز بھی کر دیا گیا ہے۔ چنانچہ اس سلسلے کا پہلا مضمون بعنوان "قرآن حکیم : قرنِ اوّل میں اور اس کے بعد" اسی شمارے میں شامل ہے۔

'افاداتِ فراہیؒ' کے عنوان سے ایک نیا سلسلۂ مضامین بھی اسی شمارے سے شروع کیا جا رہا ہے جس کے تحت گاہے بگاہے ایسے مضامین شائع کئے جائیں گے جن کے ذریعے نہ صرف یہ کہ امام حمید الدین فراہیؒ کی شخصیت اور اُن کے مکتبِ فکر کا بھرپور تعارف بھی ہو جائے بلکہ تدبرِ قرآن کے کام کو اُس سائنٹیفک منہاج پر آگے بڑھانے میں مدد مل سکے جس کے بانی اس دَور میں امام حمید الدین فراہیؒ ہیں۔

آج کل امریکہ کے ایک محقق جناب رشاد خلیفہ کی ایک تحقیق کا بہت چرچا ہے جس کی رُو سے قرآن مجید کی ایک ریاضیاتی بنیاد بھی ہے اور اس میں ۱۹ کے عدد کو ایک کلیدی حیثیت حاصل ہے۔ آغاز میں اس تحقیق کو بالعموم حیرت آمیز مسرّت کے جذبات کے ساتھ دیکھا اور قبول کیا گیا۔ لیکن بعد میں جب رشاد خلیفہ نے اپنی اس تحقیق کی بنیاد پر حفاظتِ متنِ قرآن کے مجمع علیہ مسئلہ کو چیلنج کیا تو علماء کے حلقوں میں تشویش کی ایک لہر دوڑ گئی اور بعض محققین نے رشاد خلیفہ کی مذکورہ بالا تحقیق کی خالص علمی انداز میں جانچ پرکھ کر کے ٹھوس دلائل کی بنیاد پر اس تحقیق کا بے بنیاد ہونا ثابت کیا۔ اس سلسلے میں جناب ارفاق ملک کا ایک تحقیقی مضمون ہمارے ایک دیرینہ کرم فرما جناب صہیب حسن صاحب نے ہمیں لندن سے ارسال کیا ہے جو اسی شمارے میں شائع کیا جا رہا ہے۔ مضمون پر ایک بھرپور نوٹ ڈاکٹر ابصار احمد صاحب نے تحریر کیا ہے جس سے نفسِ مسئلہ کو سمجھنے میں خاصی مدد ملتی ہے۔ یہ مضمون اور اس پر ادارتی نوٹ چونکہ انگریزی زبان میں ہیں لہٰذا اُردو دان قارئین کی سہولت کے لیے ہم اسی موضوع پر مولانا عبد القدوس ہاشمی کے ایک بلند پایہ تحقیقی مضمون کو بھی شاملِ اشاعت کر رہے ہیں جس سے جناب رشاد خلیفہ کی مذکورہ بالا تحقیق کی مکمل تفصیل اور اس پر بھرپور تنقیدی جائزہ صحیح سیاق میں سامنے آتا ہے۔

'حکمتِ قرآن' کی تنگ دامانی کے باعث بعض سلسلہ وار مضامین اس شمارے میں شامل نہیں کئے جا سکے۔ آئندہ کوشش کی جائے گی کہ تمام سلسلہ وار مضامین کو ایک عمدہ توازن کے ساتھ شاملِ اشاعت کیا جا سکے۔

حکمت و عبر

ڈاکٹر اسرار احمد

ماہِ نومبر ہمارے ملک میں علامہ اقبالؒ کے یومِ پیدائش کی مناسبت سے تقریبات اور مجالس کا مہینہ ہوتا ہے۔ جس میں سرکاری اور نجی ہر سطح پر شاندار اور نسبتاً چھوٹے پیمانوں پر جلسوں اور محافل کا اہتمام کیا جاتا ہے۔ اس بات سے قطع نظر کرتے ہوئے کہ آیا ہمارے دین میں پیدائش یا وفات کے دن منانے کا کوئی جواز ہے یا نہیں، ان مجالس کی افادیت اس اعتبار سے بہرطور مسلّم ہے کہ ان کے ذریعے علامہ اقبال کے افکار کی علمی سطح پر نہ سہی، کم از کم عوامی سطح پر تشہیر ضرور ہوتی ہے اور سرکاری و نیم سرکاری ذرائع ابلاغ عامہ سے ان کے دینی، ملّی اور فلسفیانہ فکر کے بہت سے گوشے نمایاں کئے جاتے ہیں۔ راقم الحروف کو بھی اس سال ان میں سے چند تقریبات میں حصّہ لینے کا موقع ملا۔ ۹ نومبر کو مرکزیہ مجلسِ اقبال کے زیرِ اہتمام ہونے والے جلسے کا کارڈ مجھے اقبال اکیڈمی کے توسّط سے ملا تھا۔ چونکہ اس مجلس میں صدرِ پاکستان، گورنر پنجاب اور متعدّد وزراء نے جلسے کو رونق بخشنی تھی اس لئے سیکیورٹی کے پیشِ نظر داخلہ بذریعہ کارڈ (دعوت نامہ) ہی ہو سکتا تھا۔ سال گذشتہ کی طرح اس سال بھی یہ تقریب الحمرا آرٹ کونسل کے وسیع آڈیٹوریم میں منعقد ہوئی۔ ایک زمانے میں یومِ اقبال پر مرکزیہ مجلسِ اقبال کا یہ جلسہ ہر لحاظ سے شاندار، بلند پایہ اور پروقار ہوا کرتا تھا۔ لیکن ادھر کچھ برسوں سے اس میں سرکاری عمل دخل بڑھتا جا رہا ہے جس سے اس کی علمی حیثیت یقیناً متاثر ہوئی ہے اور درویشانہ رنگ کی بجائے تکلّف و اہتمام اور درباری طمطراق نمایاں ہونے لگا ہے۔ میری اس اجلاس میں شرکت صرف ایک عام سامع کی حیثیت سے تھی۔ بہت سے مقالات اور تقاریر میں سے "سفیرِ اقبال" جناب پروفیسر مرزا محمد منوّر کی تقریر اور "مدیرِ تکبیر" جناب صلاح الدین اور ڈاکٹر محمد یوسف گورایہ کے مقالات یقیناً بہت فکر انگیز تھے اور سامعین کے جذباتِ ایمانی کی افزونی کا باعث بنے ہوں گے۔

پروفیسر مرزا محمد منوّر صاحب کی سفارتِ اقبال کا حلقہ پہلے ملک گیر تو تھا ہی، اب وہ بیرونِ پاکستان بھی مصروفِ عمل ہے۔ پچھلے سال قاہرہ اور اب نومبر میں دمشق کے کئی مقامات کی یونیورسٹیوں اور متحدہ امارات میں پروفیسر صاحب نے فکرِ اقبال کو علمی حلقوں میں روشناس کرانے میں اہم حصہ ادا کیا ہے۔ اگرچہ محمد اقبال عرب ممالک میں متعدد تراجم کی وجہ سے اب جانا پہچانا نام ہے لیکن اس طرح کی علمی مجالس اور اس میں پاکستانی سکالرز کی نمائندگی اور بالخصوص پروفیسر صاحب جیسی مسلّم اور اعلیٰ فکری و ادبی شخصیتوں کی شمولیت ہر لحاظ سے مفید اور مؤثر رہتی ہے۔

پروفیسر مرزا محمد منوّر صاحب کی تقاریر کا ایک پہلو جو مجھے متاثر کیے بغیر نہیں رہ سکتا وہ ان کی اسلام، پاکستان اور عالمِ اسلام کے بارے میں امید اور رجائیت پسندی کی روش ہے۔ مذکورہ بالا مجلس میں بھی جب پروفیسر صاحب نے کنفیڈریشن کی بات کی (جو وطنِ عزیز کی موجودہ سیاسی صورتِ حال اور ملکی سالمیت کے دشمنوں کے حوالے سے ایک چونکا بلکہ سہما دینے والا لفظ ہے!) لیکن اسے پاکستان، افغانستان اور مسلم وسطی ایشیائی خطوں کے اتّحاد کے لئے استعمال کیا تو ایک لمحے کے لئے پورے مجمع پر مسرّت و انبساط کی لہر دوڑ گئی۔ اسی طرح متعدد خطبات اور تقاریر میں میں نے پروفیسر صاحب کو ایک حدیثِ رسول ؐ کا حوالہ دیتے سُنا ہے کہ —

" اِتَّقُوْا فِرَاسَۃَ الْمُؤْمِنِ فَاِنَّہٗ یَنْظُرُ بِنُوْرِ اللّٰہِ " — مومن کی فراست سے بچو کیونکہ وہ اللہ کے نور سے دیکھتا ہے۔ پروفیسر صاحب کے یہ خیالاتِ عالیہ سننے کے بعد کم از کم میرے ذہن میں یہ سوال ضرور ابھرتا ہے کہ کاش وہ ایک لمحے کے لئے موجودہ مسلمانوں اور بلادِ اسلامیہ کی حالت پر واقعیت پسندانہ نگاہ بھی ڈال لیں اور پھر عملاً ان بلند بانگ دعاوی اور مستقبل کی ان خواہشات کو حقیقت کا روپ دینے کی کوشش کریں —

حدیثِ رسول صلعم کے بارے میں ہمارا ایمان ہے کہ وہ غلط نہیں ہو سکتی لیکن اس کو کسی مجمع میں پیش کرنے کا اصل فائدہ تب ہی ہے کہ سامعین پر حقیقی مومن ہونے کے اوصاف واضح کیے جائیں اور ایمان کے مقتضیات کو کما حقہٗ پورا کرنے کے لئے عمل پر ابھارا جائے۔ ورنہ ظاہر ہے کہ صرف خوش فہمی اور خوش عقیدگی سے مسائل کبھی حل نہیں ہوتے اور ٹھوس حقائق و واقعات آرزوں اور تمناؤں کا منہ چڑاتے رہتے ہیں —

۹ نومبر کی رات کو سوا نو بجے ریڈیو پاکستان لاہور سے کتابوں پر تبصرے کے پروگرام میں پروفیسر مرزا محمد منوّر صاحب کی کتاب Dimensions of Iqbal پر تبصرہ نشر کیا گیا جو میں نے دو روز قبل ریکارڈ کرا دیا تھا۔ یہ کتاب اہم موضوعات پر انگریزی میں پروفیسر صاحب کے چند مقالات کا مجموعہ ہے جن کی انہوں نے فکرِ اقبال کی روشنی میں تشریح و توضیح کی ہے۔ راقم الحروف شعبۂ فلسفہ (پنجاب یونیورسٹی) میں طلباء کی علمی اور سوشل سرگرمیوں کا انچارج ہے۔ چند طلبا و طالبات نے علامہ اقبال پر ایک پروگرام شعبہ میں منعقد کرنے کی خواہش کا اظہار کیا۔ چنانچہ انہیں مناسب ہدایات دی گئیں۔ معلوم ہوا کہ طلبا میں سے چند نے اس کی مخالفت کی۔ ان کا خیال تھا کہ اقبال کوئی اتنا اہم مفکّر نہیں ہے کہ اس پر شعبۂ فلسفہ میں کسی تقریب کا اہتمام ہو۔ جیسا کہ میں سطور ذیل میں قدرے تفصیل سے عرض کروں گا، کالجوں اور یونیورسٹیوں کے طلباء کے ایک گروہ میں یہ فکر بعض اہم دانشوروں کی تحریروں کے زیرِ اثر جڑ پکڑ رہا ہے جن میں اقبال کو ندرتِ فکر سے تہی دامن اور مفکّر کی بجائے روایتی مذہب کا حامی قرار دیا جاتا ہے۔ یا بعض دوسرے ترقّی پسند شعراء اور اہلِ قلم مثلاً فیض احمد فیضؔ کے مقابلے میں کم تر حیثیت کا شاعر ثابت کیا جاتا ہے۔ اس طرح کا ایک بہت بھونڈا تقابلی مطالعہ پچھلے دنوں لاہور کے ایک فائیو سٹار ہوٹل میں پرہجوم تقریب کے سامنے ہمارے ملک کے ایک چوٹی کے دانشور پروفیسر کرار حسین نے پیش کیا۔ جسے ایک مخصوص حلقے میں بہت پذیرائی حاصل ہوئی اور ظاہر ہے کہ اس قبیل کے خیالات کا اثر اوپر کی سطح سے نیچے اتر کر طلباء تک بھی پہنچتا ہے جن کی تنقیدی صلاحیت ابھی ناپختہ ہوتی ہے اور وہ صرف "بڑے ناموں" سے متاثر ہونا جانتے ہیں۔ بہرحال ۲۰ نومبر کو شعبے میں مذکورہ بالا نشست منعقد ہوئی۔ شعبۂ فلسفہ کے علاوہ یونیورسٹی کے دوسرے شعبوں سے بھی تیرہ چودہ طلباء اور طالبات نے علامہ اقبال اور ان کے فکر و فن کے مختلف پہلوؤں پر اپنی تحریریں سامعین کے سامنے پیش کیں۔ افسوس ہے کہ ان میں سے اکثر کا علمی معیار بہت پست تھا لیکن طالب علموں کی کوشش کے اعتبار سے بہرحال انہیں سراہا گیا۔

۲۷ نومبر کی سہ پہر لاہور میوزیم کے زیرِ اہتمام اقبال کے یوم پیدائش کے سلسلے میں ایک

نشست کا اہتمام کیا گیا۔ اس میں دو تقاریر ہوئیں ایک پنجاب یونیورسٹی اورینٹل کالج کے شعبۂ اردو کے پروفیسر اور سربراہ جناب ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا کی اور دوسری راقم الحروف کی۔ یہ تقریر میں نے مختصر نوٹس کی مدد سے کی تھی۔ انشاء اللہ عنقریب اس تقریر میں پیش کئے گئے خیالات کو بالتفصیل احاطۂ تحریر میں لاؤں گا۔ سردست اس کے اہم نکات مختصراً ہدیۂ قارئین کر رہا ہوں:

اقبال اور فکرِ اقبال کے ضمن میں ہمارے ہاں دو مختلف نقطۂ نظر پائے جاتے ہیں ــــ دانشوروں اور اصحابِ قلم کا ایک گروہ وہ ہے جو اقبال دشمنی پر ادھار کھائے بیٹھا ہے اور اقبال کو سو فیصد رجعت پسندی کا نمائندہ قرار دیتا ہے۔ اس فکر کے لوگ بالعموم سرکاری اور نیم سرکاری سرپرستی میں ہونے والی مجالس اور جملہ نشر و اشاعت سے تعلق رہتے ہیں۔ تند و تلخ منفی تنقید اور سب و شتم کے علاوہ ان کے ہاں اور کچھ سننے یا پڑھنے کو نہیں ملتا۔ مجھے بعض ایسی مجلسوں میں جانے کا موقع ملا ہے۔ جہاں اس قسم کے حضرات اپنی عام گفتگو میں تمام اخلاقی حدود کو پامال کرتے ہوئے فریقِ مخالف کے لئے فحش گوئی اور گالیوں تک کا استعمال کھلے بندوں کرتے ہیں۔ اگر اس گروہ کے منفی رویے کا بنظرِ غائر مطالعہ کیا جائے تو اس کے پس منظر میں دو عوامل کارفرما نظر آتے ہیں۔ اوّلاً یہ کہ اُن میں سے اکثر نظریاتی طور پر ملحد اور دہریت یا مارکس ازم کے علمبردار ہیں۔ اور جب وہ دیکھتے ہیں کہ اقبال اپنے فکر اور شاعری میں ہر جگہ قرآن، رسول، معاد اور آخرت کی بات کرتے ہیں تو سوائے مخالفت اور الزام تراشی کے اُن کی طرف سے کسی اور رویے کا اظہار نہیں ہوتا۔ ان کا صحیح طرزِ عمل یہ ہونا چاہیئے تھا کہ وہ علمی انداز میں اور "بیّنہ" اور "بُرھان" یعنی واضح دلیل کے ذریعے اقبال کے قرآنی معتقدات کا مقابلہ کرتے۔ لیکن ان میں سے شاید ہی کسی نے اس کی ہمت یا جرأت کی ہے۔ اقبال دشمنی میں دوسرا کارفرما عنصر خالص نفسیاتی نوعیت کا ہے۔ اقبال کا فکر اتنی بلندی اور رفعت کا حامل ہے اور اس کا شاعرانہ کلام اتنے ادبی محاسن کا مرقع ہے کہ آج کے دانشوروں، شعراء اور اہلِ قلم کی اکثریت اپنے آپ کو ان کے مقابلے میں بہت پست اور کم حیثیت پاتی ہے۔ چنانچہ وہ بالعموم حسد کا شکار ہو کر ذاتی سطح کی عیب جوئی اور

تنقیص پر اتر آتے ہیں۔ انہی دونوں عناصر کا ملغوبہ پروفیسر کرار حسین کا وہ مقالہ ہے جس کا حوالہ میں نے سطور بالا میں دیا۔ اس میں آپ کو کہیں بھی سنجیدہ اور علمی تنقید اور دلیل نہیں ملے گی بلکہ تنقیص اور تعییب کا انتہائی بھونڈا انداز اختیار کیا گیا ہے۔

دوسرا گروہ ان اسلام پسند لیکن جدیدیت کے دلدادہ لوگوں کا ہے جو اسلام کا لیبل تو اپنے اوپر سے ہٹانا نہیں چاہتے بلکہ اپنے موروثی اسلام کا اعلان ببانگِ دہل کرتے ہیں لیکن ساتھ ہی نظریاتی طور پر اس حد تک جدیدیت، مغربی طرزِ فکر اور روشِ حیات کے قائل ہیں کہ عصری تقاضوں کی آڑ میں وہ اسلام کے اساسی قوانین اور تہذیبی ڈھانچے تک میں تبدیلی کے قائل ہیں۔ اور وہ اس کی دلیل خود اقبال کے الفاظ میں پیش کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ اقبال ایک ساکت و جامد مذہب کا نہیں بلکہ متحرک اور ترقی پذیر اسلام کا قائل تھا چنانچہ ان حضرات کا سلوگن " اقبال سے آگے " (Forward from Iqbal) یا " Beyond Iqbal " ہے۔ اس ضمن میں یہ حضرات علامہ اقبال کی " تشکیلِ جدید الٰہیاتِ اسلامیہ " کے پیش لفظ میں موجود ان سطور کا حوالہ بکثرت دیتے ہیں:

" فلسفیانہ غور و تفکر میں قطعیت کوئی چیز نہیں۔ جیسے جیسے جہان علم میں ہمارا قدم آگے بڑھتا ہے اور فکر کے لئے نئے نئے راستے کھل جاتے ہیں، کتنے ہی اور، اور شاید ان نظریوں سے جو ان خطبات میں پیش کئے گئے ہیں، زیادہ بہتر نظریئے ہمارے سامنے آتے جائیں گے۔ ہمارا فرض بہرحال یہ ہے کہ فکرِ انسانی کے نشوونما پر باحتیاط نظر رکھیں اور اس باب میں آزادی کے ساتھ نقد و تنقید سے کام لیتے رہیں۔ "

(ترجمہ: سید نذیر نیازی، صفحہ ۴)

اسی طرح ان دانشوروں کی طرف سے "تشکیلِ جدید" کے چھٹے خطبہ بعنوان " اسلام کے ترکیب یا ہیئت ترکیبی میں حرکت کا اصول"، یا بالفاظِ دیگر " الاجتہاد فی الاسلام"، کا چرچا تو بہت زور شور سے کیا جاتا ہے لیکن اسلام کی اجتہادی اور تخلیقی صلاحیتوں کو بروئے کار لانے کے لئے مفکرین اور علماء کو علم کے کس درجے اور ذہن و قلب کی کن صفات سے متصف ہونا چاہیئے، اس کا ذکر نہ ہونے کے برابر ہے۔ اس میں شک نہیں کہ اسلام معاشرے میں

جمود، اندھی تقلید اور ٹھہراؤ کو تکلیف دہ باتیں گردانتا ہے لیکن ان سب میں ایک گونہ شدّت اس وقت پیدا ہو جاتی ہے جب نام نہاد پروگریسو اور مخالف قوتیں اجتہاد کے نام پر انقلاب و تبدیلی کے اس موڑ تک بڑھ آئیں کہ جہاں مسلّمات، اصول اور پختہ و مستند روایات کی دیواریں ایک ایک کر کے گرنے لگیں۔

جدیدیت پسند دانشوروں کی "اقبال سے آگے" (Beyond Iqbal) پالیسی اور نظریات کا نتیجہ عملاً ہمارے کالجوں اور یونیورسٹیوں کے طلبا پر بالعموم یہ مترتّب ہوا ہے کہ وہ اب اقبال کو سرے سے درخورِ اعتنا نہیں سمجھتے۔ اور آگے یا نئی تعمیر کی خام سوچ اور فکر انہیں ان مسلّمات سے بالکل غافل کئے دے رہی ہے جن پر اقبال نے انتہائی جامعیت گہرائی اور عارفانہ انداز میں کلام کیا ہے۔ کیا اس حقیقت سے کوئی انکار کر سکتا ہے کہ جہاں تک دینِ حق کے اسرار و رموز اور حقائق و معارفِ ایمانی اور علم و حکمتِ قرآنی کا تعلق ہے علّامہ مرحوم کو رومیِ ثانی کہا جا سکتا ہے۔ روحِ دین کی تشریح و تعبیر جس گہری بصیرت، سلاست اور شگفتگی کے ساتھ اقبال نے کی ہے اس کی نظیر مشکل ہی سے پیش کی جا سکتی ہے۔ مندرجۂ ذیل اشعار اس اعتبار سے حد درجہ اہم ہیں:

؎ عقل و دل و نگاہ کا مُرشدِ اوّلیں ہے عشق
عشق نہ ہو تو شرع و دیں بُتکدۂ تصوّرات

اور ؎ شوق اگر ترا نہ ہو میری نماز کا امام،
میرا سجود بھی حجاب میرا قیام بھی حجاب

اسی طرح ؎ بجھی عشق کی آگ اندھیر ہے مسلماں نہیں خاک کا ڈھیر ہے

یا ؎ رہ گئی رسمِ اذاں روحِ بلالی نہ رہی
فلسفہ رہ گیا تلقینِ غزالی نہ رہی

علّامہ اقبال کا قرآن کے ساتھ تعلق اظہر من الشمس ہے۔ چنانچہ کہتے ہیں:

؎ گر دلم آئینہ بے جوہر است ور بحرفم غیرِ قرآں مضمر است
پردۂ ناموسِ فکرم چاک کن ایں خیاباں را ز خارم پاک کن

روزِ محشر خوار و رسوا کن مرا ۔۔۔ بے نصیب از بوسہ پا کن مرا

واقعہ یہ ہے کہ اقبال کے ساتھ قرآن کا تعلق خود عظمت و اعجازِ قرآن کا ایک بین ثبوت ہے۔ اقبال، جس نے وقت کی اعلیٰ ترین سطح پر مشرقی و مغربی علوم پڑھے، قدیم و جدید سب کا مطالعہ کیا — لیکن جب بالآخر اس کے ذہن کو سکون و اطمینان ملا تو صرف قرآن حکیم سے، اور علم کی پیاس بجھی تو صرف کتاب اللہ سے۔ گویا بقول خود اُن کے ؎

نہ کہیں جہاں میں اماں ملی جو اماں ملی تو کہاں ملی ۔۔۔ مرے جرم خانہ خراب کو ترے عفوِ بندہ نواز میں!

علامہ اقبال نے اساساتِ دین کا گہرا اور پُربصیرت شعور جس طرح مسلمانوں کی آئندہ نسل کو منتقل کرنے کی کوشش کی ہے، تعلق مع اللہ، حُبِّ رسول اور عبادات کی رُوح کو جس طرح واضح کیا ہے اور پھر نظامِ دین کی توضیح و تفسیر کے ضمن میں وحدتِ خالق، وحدتِ انسانیت، انسانی حریت، اخوت و مساوات اور اسلامی سیاسی و معاشی تصورات کو جس حکیمانہ پیرائے میں بیان کیا ہے، ہماری نئی نسل کو ان سے رُوشناس کرانے کی شدید ضرورت ہے۔ اگر وہ ان تمام موضوعات پر علامہ اقبال کے خیالات سے کماحقہٗ واقف ہوں تو مجھے یقین ہے کہ انہیں یہ بات کہنے میں باک نہ ہوگا کہ اقبال سے زیادہ پروگریسو خیالات انہیں کہیں نہیں مل سکتے۔ تعمیرِ نَو محکم اساسات پر ہی واقعی اور حقیقی ہوتی ہے۔ چنانچہ الٰہیات اور بعض قانونی و فقہی معاملات کے علاوہ جہاں واقعتاً مسلسل غور و تفکر اور اجتہادی حرکت کی ضرورت ہے ہمیں اقبال کی تعلیمات اور افکار کو اَز سرِ نَو پڑھنے اور اپنے اندر جذب کرنے کی طرف متوجہ ہونا چاہیئے۔ فکر کی دنیا میں اقبال کو حرفِ آخر نہ سمجھتے ہوئے بھی تجدید و احیائے اقبال وقت کا اہم ترین تقاضا ہے۔ "اقبال سے آگے" (Beyond Iqbal) کی یک رُخی دانشورانہ روش میں فکرِ اقبال کی کُلّی تفہیم و انجذاب سے اعتدال پیدا کیا جانا چاہیئے ہمارے ہاں علمی سطح پر موجود کنفیوژن صرف اسی طرح ختم ہو سکتا ہے کہ صحت مند اجتہاد اور فکرِ نَو کے ساتھ ساتھ "محکماتِ اقبال" کو بھی اُجاگر کیا جائے اور فکرِ اقبال کی دریافتِ نَو ("REDISCOVER IQBAL" ——) کی مہم کو قومی سطح پر خلوص اور عزم و ارادہ کے ساتھ شروع کیا جائے۔

ہدایت القرآن (۱۱)

مولانا محمد تقی امینی

آخرت کا ثبوت

كَيْفَ تَكْفُرُوْنَ بِاللّٰهِ وَكُنْتُمْ اَمْوَاتًا فَاَحْيَاكُمْ..... الخ
وَهُوَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ

تم اللہ کا کیسے انکار کرتے ہو حالانکہ تم بے جان تھے، پھر اس نے تمہیں زندہ کیا، پھر موت دے گا پھر تمہیں زندہ کرے گا، پھر تم اسی کے پاس واپس جاؤ گے۔ [1] اللہ وہ ہے جس نے تم سب کے لئے زمین کی ساری چیزیں پیدا کیں۔ [2] پھر آسمان کی طرف متوجہ ہوا تو انہیں سات آسمان بنایا اور وہ ہر چیز جانتا ہے۔ [3]

○

[1] یہ خطاب بھی تمام انسانوں کے لئے ہے۔ کسی خاص گروہ و زمانہ کے لئے نہیں ہے۔ پہلے اس حقیقت کو ظاہر کیا کہ آخرت سے انکار گویا اللہ کا انکار ہے۔ اس وجہ سے کہ آخرت کو مانے بغیر اللہ کو ماننے کی بات بے معنی رہتی ہے، پھر خاص انداز میں آخرت کی زندگی کو سمجھایا اور فرمایا کہ تم پہلے بے جان تھے۔ تمہیں زندگی ملی، پھر موت آئے گی اس کے بعد اللہ ہی کی طرف واپسی ہوگی۔

یہ واپسی گویا اسی طرح ہوگی جس طرح کی واپسی اس 'پردیسی' کی ہوتی ہے جو کمانے کے لئے باہر جاتا ہے اور پھر اپنے گھر واپس آتا ہے۔ آیت میں آخرت کی زندگی کے لئے رجوع (لوٹنا۔ واپس ہونا) کا لفظ لایا گیا ہے جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ زندگی پہلے اللہ کے پاس تھی۔ درمیان میں نیکی اور بھلائی کمانے کے لئے دنیا میں بھیجی گئی، پھر اللہ ہی کے پاس واپس جائے گی، لیکن اللہ کے پاس لوٹنے سے یا واپس ہونے سے پہلے موت ضروری ہے جس طرح ہر شے کا تخم (بیج) مٹی میں ملنے کے بعد سرسبز و شاداب بن کر نکلتا ہے۔ اسی طرح زندگی کا

نخم (بیج) بھی مٹی میں ملنے کے بعد آخرت کی زندگی کی شکل اختیار کرتا ہے۔

پھر دیں یہ بیان فرمائی کہ جس زندگی کے لئے زمین و آسمان کا نظام قائم کیا گیا اور جس کو پروان چڑھانے کے لیے ساری چیزیں پیدا کی گئیں۔ اگر وہ زندگی اسی دنیا پر ختم ہو جاتی اور آگے نہ بڑھتی تو یہ سارا نظم و انتظام گھنڈرے کا کھیل بن کر رہ جاتا اور چند دن زندگی گذارنے کے علاوہ کوئی پائیدار مقصد اس سے نہ حاصل ہوتا۔ دوسرا بڑا انسان یہ ہوتا کہ زندگی ہر قید و بند سے آزاد ہو کر اسی سطح پر آجاتی جو جانوروں کی سطح ہے۔ حالانکہ انسان انسان ہے جس کو اپنی عزت و شرافت برقرار رکھنے کے لئے پابندی ضروری ہے اور جانور جانور ہے جس کو اپنی زندگی گذارنے کے لیے انسان جیسی پابندی نقصان دہ ہے۔

زمین و آسمان کا انتظام اور اس کی ساری چیزیں اس لئے ہیں کہ انسان اللہ کا فرمانبردار رہ کر اپنی ذمہ داریاں پوری کرے۔ عزت و شرافت کے ساتھ زندگی گذارے اور چیزوں کو استعمال کر کے زیادہ سے زیادہ ان کو مفید و کارآمد ثابت کر دکھائے، نیکی و بھلائی کمانے میں، یہ سب داخل ہیں۔ اگر بات اسی زندگی پر ختم ہو گئی آگے نہ بڑھی تو انسان نہ اپنی ذمہ داریاں پوری کرے گا نہ عزت و شرافت برقرار رکھنے میں کوئی پابندی محسوس کرے گا۔ نہ دنیا کی بیشمار محرومیوں اور ناکامیوں کا صلہ پائے گا اور نہ چیزوں کو مفید و کارآمد ثابت کرنے میں کوئی اعلیٰ مقصد (اللہ کی رضا و خوشنودی اور آخرت میں کامیابی سامنے رکھے گا۔

رہی یہ بات کہ دوسری زندگی کہاں ہوگی؟ اس دنیا میں ہوگی یا اور کہیں ہوگی؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ اس دنیا میں جس قدر ناگواریاں پیش آتی ہیں رنج و تکلیف کا تجربہ ہوتا ہے اور حوصلوں کا خون کرنا پڑتا ہے ان کے پیش نظر ہر شخص کا جی یہی چاہتا ہے کہ دوسری زندگی یہاں نہ ہو یا کم سے کم اس زمین کے اوپر اور اس آسمان کے نیچے نہ ہو، پھر کہاں ہو؟ ایسی جگہ ہو جہاں ہمارا محبوب و دل کا پیارا (اللہ ﷻ) اپنی تمام تر جلوہ آرائیوں کے ساتھ نمودار ہو۔ آمنے سامنے گفتگو کے مواقع ہوں، وعدے وعید پورے ہوتے اپنی آنکھوں سے دیکھیں پھر انتہائی شکر گذاری کے عالم میں یہ کہتے ہوتے اس کے سامنے عجز و نیازمندی کا سر رکھ دیں۔

ترے جلووں کے آگے ہمت شرح و بیاں رکھ دی

زبانِ بے نگہ رکھ دی نگاہِ بے زباں رکھ دی!!!

لہ یعنی اللہ نے جتنی چیزیں پیدا فرمائیں وہ سب کے لئے ہیں۔ ہر شخص ان کو لینے اور

حاصل کرنے کا حق دار ہے۔ اللہ کی طرف سے کوئی رکاوٹ نہیں ہے، رکاوٹ جو کچھ ہے وہ اپنی طرف سے ہے کہ لینے اور حاصل کرنے کے لئے جیسی محنت، تدبیر اور جد وجہد درکار ہے وہ نہ ہو سکی، یا رکاوٹ دوسروں کی طرف سے ہے کہ یہ لوگ وہ اسباب و ذرائع نہ مہیا کرسکے کہ جن سے دوسروں کو لینے اور حاصل کرنے میں سہولت ہوتی۔

سماء کے معنی بلندی اور وسعت کے ہیں۔ زمین سے اوپر آسمان کے نام سے جو کچھ ہے اس کے بارے میں اب تک جتنا معلوم کیا گیا ہے وہ اس کے مقابلے میں بہت کم ہے جو معلوم نہیں کیا جا سکا ہے۔ اس کا اقرار ماہرین فن کو اچھی طرح ہے بلکہ اس سے کہیں زیادہ یہ ہے کہ ماہرین فن جس قدر علم و تحقیق میں آگے بڑھتے جاتے ہیں ان کی حیرت میں اضافہ ہوتا جاتا ہے اور اللہ کی غیر محدود قدرت اور جو کچھ آسمان کے نام سے ہے اس کی بے پایاں وسعت و بلندی معلوم کرنے میں اپنی بے بسی کے اقرار پر انہیں مجبور ہونا پڑتا ہے۔ ایسی حالت میں جو کچھ معلوم ہے اسکو بنیاد بنا کر سات آسمان کی تفسیر کرنا اٹکل میں تیر چلانا ہے۔ مناسب یہی معلوم ہوتا ہے کہ سات آسمان کا مطلب اللہ کے علم کے حوالہ کیا جائے اور اس سے اللہ کی غیر محدود قدرت اور آسمان کی بے پایاں وسعت و بلندی کا یقین کیا جائے۔

پھر دوسری جگہ طبقات کا ذکر ہے (سَبْعَ سَمٰوٰتٍ طِبَاقًا ۔ ملک ۳، نوح ۱۵) سات آسمان اوپر نیچے) جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اوپر نیچے سات آسمان ہیں۔ ممکن ہے زمین سے اوپر جس قدر عالم ہیں اور وہ بہت ہیں ان کو سات طبقوں میں تقسیم کیا گیا ہو اور بلندی و وسعت کے لحاظ سے ہر طبقہ کے آسمان علیحدہ علیحدہ اور ایک دوسرے سے بڑھ چڑھ کر ہوں۔ دیہ بھی ایک اندازہ ہے حقیقت حال کا علم اللہ ہی کو ہے

علم و تحقیق کی جدید دنیا نے زمین سے اوپر کے متعلق جس قدر معلومات فراہم کی ہیں ان میں کوئی بھی قرآن کے خلاف نہیں ہے۔ البتہ اس کا ایک حصہ پرانا قدیم علم و تحقیق کے بے شک خلاف ہے جس کو لوگوں نے قرآن کے خلاف سمجھ رکھا ہے۔ (جاری ہے)

قرآن حکیم کی مقدس آیات اور احادیث نبوی آپکی دینی معلومات میں اضافہ اور تبلیغ کے لئے اشاعت کی جاتی ہیں۔ ان کا احترام آپ پر فرض ہے لہٰذا جن صفحات پر یہ آیات درج ہیں ان کو صحیح اسلامی طریقہ کے مطابق بے حرمتی سے محفوظ رکھیں۔

قرآنِ حکیم

قرنِ اوّل میں اور اس کے بعد

بَدْءُ الاسلام میں اسلام کی دو عظیم ترین حقیقتیں

قرآن حکیم اور جہاد فی سبیل اللہ

قرآن: منبع و سرچشمۂ ایمان و یقین، اور جہاد: ایمانِ حقیقی کا مظہرِ اتم

واقعہ یہ ہے کہ بُدءِ الاسلام میں دین کی اصل اساسی اور بنیادی حقیقتیں دو ہی تھیں — ایک قرآنِ حکیم جسے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی انقلابی جِدّوجہد کے ضمن میں 'آلہ انقلاب' کی حیثیت حاصل ہے بقول مولانا حالی ؎

اتر کر حرا سے سوئے قوم آیا
اور اک نسخہ کیمیا ساتھ لایا

اور دوسرے جہاد فی سبیل اللہ جو جامع عنوان ہے آپؐ کی اس جِدّوجہد کے مختلف مدارج و مراحل کا۔

واقعہ یہ ہے کہ یہ قرآن مجید ہی کی گرج اور کڑک تھی جس نے نیند کے ماتوں کو جگایا اور خوابِ خرگوش کے مزے لوٹنے والوں کو بیدار کیا۔ چنانچہ "وَالْعَصْرِ ۝ اِنَّ الْاِنْسَانَ لَفِیْ خُسْرٍ ۝" اور "اِقْتَرَبَ لِلنَّاسِ حِسَابُهُمْ وَهُمْ فِیْ غَفْلَةٍ مُّعْرِضُوْنَ ۝" کی چونکا دینے

والی صدائیں اور "اَلْقَارِعَةُ ۝ مَا الْقَارِعَةُ ۝ وَمَآ اَدْرٰىكَ مَا الْقَارِعَةُ ۝" اور "اَلْحَآقَّةُ مَا الْحَآقَّةُ ۝ وَمَآ اَدْرٰىكَ مَا الْحَآقَّةُ ۝" کی بیدار کن ندائیں ہی تھیں جنہوں نے پورے عرب میں ہلچل مچادی اور "عَمَّ يَتَسَآءَلُوْنَ ۝ عَنِ النَّبَاِ الْعَظِيْمِ ۝ الَّذِىْ هُمْ فِيْهِ مُخْتَلِفُوْنَ ۝" کی کیفیت پیدا کردی۔ بقول مولانا حالی ؎

وہ بجلی کا کڑکا تھا یا صوتِ ہادی ۔۔۔ عرب کی زمیں جس نے ساری ہلادی

پھر ۔۔۔ اسی کی آیات بیّنات تھیں جنہوں نے هُوَ الَّذِىْ يُنَزِّلُ عَلٰى عَبْدِهٖٓ اٰيٰتٍۢ بَيِّنٰتٍ لِّيُخْرِجَكُمْ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ ۝ (الحدید ۹) کے مصداق انسانوں کو شرک، الحاد، مادہ پرستی، حُبِّ عاجلہ، اور حیوانیّتِ محضہ کے "ظُلُمٰتٌۢ بَعْضُهَا فَوْقَ بَعْضٍ" ایسے مہیب اور ہولناک اندھیروں سے نکال کر ایمان اور یقین کی روشنی سے بہرہ ور فرمایا۔ چنانچہ وہ ایک طرف عرفانِ الٰہی اور محبّتِ خداوندی سے سرشار یعنی مستِ بادۂ الست ہوگئے اور دوسری طرف دنیا و مافیہا ان کی نگاہوں میں مچھر کے پَر سے بھی حقیر تر ہوگئے اور وہ کُلّیۃً طالبِ عقبیٰ بن گئے

مزید برآں ۔۔۔ وہی تھا جو "مَّوْعِظَةٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ" بھی بن کر آیا، اور "شِفَآءٌ لِّمَا فِى الصُّدُوْرِ" بھی! چنانچہ اُسی کے ذریعے لوگوں کا تزکیۂ نفس بھی ہوا اور تصفیۂ قلب و تجلیۂ روح بھی!

گویا انذار ہو یا تبشیر، تبلیغ ہو یا تذکیر، موعظت ہو یا نصیحت، تعلیم ہو یا تربیت، تزکیہ ہو یا تصفیہ، تجلیہ ہو یا تنویر ۔۔۔ الغرض تطہیر ہو یا تعمیر مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ صلی اللہ علیہ وسلم کا پورا عملِ دعوت و اصلاح قرآن مجید ہی کے گرد گھومتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن حکیم میں ایک نہ دو پورے چار مقامات پر آنحضورؐ کے منہجِ انقلاب کو جن اساسی اصطلاحات کے ذریعے واضح کیا گیا ہے اُن کا اوّل و آخر خود قرآن مجید ہی ہے۔ بفحوائے الفاظِ قرآنی:

يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ وَ	سناتا ہے انہیں اُس کی آیات اور
يُزَكِّيْهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ	پاک کرتا ہے ان کو اور سکھاتا ہے انہیں
الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ (الجمعہ: ۲)	کتاب اور حکمت!

قرآن کا کارنامہ، ایک جملے میں بیان کیجئے، تو یہ ہے کہ اس نے صحابۂ کرام رضوان اللہ تعالیٰ اجمعین کے دلوں میں ایمان پیدا کر دیا اور توحید، معاد اور رسالت پر یقینِ محکم کی کیفیت

پیدا کر دی لیکن اِس سے اُس ہمہ گیر تبدیلی کا اندازہ نہیں ہوتا جو قرآنِ حکیم کے بدولت اُن کی زندگیوں میں برپا ہو گئی تھی اِس لیے کہ قرآن نے اُن رضہ کا فکر بدلا، سوچ بدلی، نقطۂ نظر بدلا، اقدار بدلیں، عزائم بدلے، اُمنگیں بدلیں، شوق بدلے، دل چسپیاں بدلیں، خوف بدلے، اُمیدیں بدلیں، اخلاق بدلے، کردار بدلے، خلوت بدلی، جلوت بدلی، انفرادیّت بدلی، اجتماعیّت بدلی، دن بدلا، رات بدلی حتّٰی کہ "تُبَدَّلُ الْاَرْضُ غَيْرَ الْاَرْضِ وَالسَّمٰوٰتُ" کے مصداق آسمان بدلا، زمین بدلی، الغرض پُوری کائنات بدل کر رکھ دی —— اور اِس پوری تبدیلی کا ذریعہ اور آلہ ہیں قرآنِ حکیم کی آیات بیّنات بقول علّامہ اقبالؒ :

بندۂ مومن زِ آیاتِ خدا است — ایں جہاں اندر بر او چوں قباست!
چوں کہن گردد جہانے در برش — می دہد قرآں جہانِ دیگرش!

تبدیلی اگر حقیقی اور واقعی ہو تو اُس کی کوکھ سے لازماً تصادم اور کشمکش جنم لیتے ہیں جن کے مراحل تبدیلی کی نوعیّت اور مقدار کی نسبت سے کم و بیش ہو سکتے ہیں۔ ایمان نے جو تبدیلی صحابہ کرامؓ میں پیدا کی اُس نے جس تصادُم اور کشمکش کو جنم دیا اُس کے جملہ مدارج و مراحل کا جامع عنوان ہے 'جہاد فی سبیل اللہ'۔

اِس تصادُم اور کشمکش کا اوّلین ظہور انسانوں کی اپنی شخصیّت کے داخلی میدانِ کارزار میں ہوا۔ یہی وجہ ہے کہ 'مجاہدہ مع النفس' کو 'افضل الجہاد' قرار دیا گیا[۱]۔ پھر جب ایمان اشخاص کے باطن میں اِس طرح راسخ اور مستولی ہو گیا کہ ریب اور تشکّک کے کانٹے نکل گئے تو اب اُسی جہاد و مجاہدہ کا ظہور عالمِ خارجی میں ظالموں، سرکشوں اور خدا کے باغیوں سے کشمکش اور تصادُم کی صُورت میں ہُوا جس کا مقصد قرار پایا 'تکبیرِ ربّ'[۲] یعنی اللہ تعالیٰ کی کبریائی کا اقرار و اعلان اور اس کی حاکمیّت مطلقہ کا

---

[۱] آنحضورؐ سے دریافت کیا گیا: "اَیُّ الْجِهَادِ اَفْضَلُ یَارَسُوْلَ اللّٰهِ" تو آپؐ نے ارشاد فرمایا: "اَنْ تُجَاهِدَ نَفْسَكَ فِیْ طَاعَةِ اللّٰهِ"!

[۲] الفاظِ قرآنی کی رُو سے "وَرَبَّكَ فَكَبِّرْ ○" (المدّثر: ۳) اور بقول علّامہ اقبالؒ

یا وُسعتِ افلاک میں تکبیرِ مسلسل — یا خاک کی آغوش میں تسبیح و مناجات
وہ مسلکِ مردانِ خود آگاہ و خدامست — یہ مذہبِ مُلّا و جمادات و نباتات

بالفعل قیام و نفاذ تاکہ "اللہ کی مرضی جیسے آسمان پر پوری ہوتی ہے زمین پر بھی ہو"![1] ـــــ اور اس کی آخری منزل ہے "قتال فی سبیل اللہ" جس کا منتہائے مقصود معیّن ہوا ان الفاظ میں کہ:

وَقَاتِلُوْهُمْ حَتّٰى لَا تَكُوْنَ	اور جنگ کرتے رہو اُن سے یہاں تک
فِتْنَةٌ وَّيَكُوْنَ الدِّيْنُ	کہ "فتنہ" بالکل فرو ہو جائے اور اطاعت
كُلُّهٗ لِلّٰهِ ۚ (الانفال: ٣٩)	کلیۃً اللہ ہی کی ہونے لگے!

ایمان و یقین اور جہاد و قتال کا یہی وہ لزومِ باہمی ہے جس کو نہایت واضح اور دوٹوک الفاظ میں بیان کیا گیا قرآنِ حکیم کی اس آیۂ مبارکہ میں:

اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ	مومن تو بس وہی ہیں جو ایمان لائے اللہ
وَرَسُوْلِهٖ ثُمَّ لَمْ يَرْتَابُوْا	پر اور اُس کے رسولؐ پر پھر شک میں
وَجَاهَدُوْا بِاَمْوَالِهِمْ وَ	نہ پڑے اور جہاد کرتے رہے اللہ کی راہ میں
اَنْفُسِهِمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۭ اُولٰۗىِٕكَ	اور کھپاتے رہے اس میں اپنے اموال
هُمُ الصّٰدِقُوْنَ ۔ (الحجرات: ١٥)	اور اپنی جانیں حقیقت میں یہی ہیں سچے!

واضح رہے کہ اِس آیۂ مبارکہ کے اوّل و آخر حصر کا اسلوب بھی ہے اور آیۂ ماقبل میں "حقیقی ایمان" اور "قانونی اسلام" کے مابین فرق و امتیاز کا مضمون بھی۔ گویا مومنِ صادق کی جامع و مانع تعریف قرآنِ حکیم کی کسی ایک آیت میں مطلوب ہو تو وہ یہی آیت ہے۔

الغرض قرآن کے اصل حاصل ہیں ایمان اور یقین اور اُن کا لازمی نتیجہ ہیں جہاد اور قتال ان میں سے ایمان و یقین اصلاً ایک معنوی حقیقت اور داخلی کیفیت کا نام ہیں، چنانچہ عالمِ خارجی میں اسلام کی دو عظیم ترین اور نمایاں ترین، حقیقتیں ہیں قرآن اور جہاد۔ یہی وجہ ہے کہ یہ دونوں ایمانِ حقیقی کی مستقل علامتوں (SYMBOLS) کی حیثیت رکھتے ہیں اور مردِ مومن کی شخصیت کا جو ہیولیٰ تخیل اور تصوّر میں اُبھرتا ہے اُس کے ایک ہاتھ میں قرآن اور دوسرے ہاتھ میں تلوار لازمی و لابدی ہیں! نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلّم کی حیاتِ طیبہ اور خلافتِ راشدہ کے دَوران اسلام کی نشأۃِ اُولیٰ،

---

[1] سیّدنا مسیح علیہ السّلام کے الفاظ۔

یا غلبۂ دینِ حق کا دَورِ اوّل بلا شائبۂ ریب و شک نتیجہ تھا صحابۂ کرامؓ کے تعلّق قرآن اور جذبۂ جہاد کا۔ لیکن یہ بھی ایک ایسی تاریخی حقیقت ہے جس سے انکار ممکن نہیں کہ جیسے ہی اسلام نے ایک مملکت اور سلطنت کی صورت اختیار کی اِن دونوں کی حیثیت ثانوی ہو کر رہ گئی۔ اور ایسا ہونا ایک حد تک منطقی اور فطری بھی تھا۔ اس لیے کہ ایک طرف تو کسی مملکت یا سلطنت میں اوّلین و اہم ترین مسئلہ شہریّت کا ہوتا ہے جو ایک خالص قانونی مسئلہ ہے جس میں تمام تر بحث انسان کے ظاہر سے ہوتی ہے، باطن سے کوئی سروکار ہی نہیں ہوتا گویا بقول علّامہ اقبال ع "بندوں کو گِنا جاتا ہے تولا نہیں جاتا!" —— مزید برآں اس کا اصل موضوع نظم و نسق اور امن و امان کا ہوتا ہے جس کے اعتبار سے بنیادی اہمیّت قانون اور ضابطے کو حاصل ہوتی ہے نہ مکارمِ اخلاق یا مواعظِ حَسَنہ کو۔ حتّٰی کہ اس اعتبار سے قصاص عفو پر مقدّم ہو جاتا ہے —— اور دوسری طرف سلطنتوں اور مملکتوں کو، خواہ وہ اصولی اور نظریاتی ہی ہوں اصل سروکار اپنی حفاظت و مدافعت سے ہوتا ہے، اصولوں اور نظریات کی تبلیغ و اشاعت ہوتی بھی ہے تو ثانوی درجے میں اور حکومتوں کی مصلحتوں کے تابع رہ کر!

یہی وجہ ہے کہ جب اسلام مملکت اور سلطنت کے دَور میں داخل ہوا تو اصل زور (EMPHASIS) ایمان کے بجائے اسلام پر، یقین کے بجائے اقرار اور شہادت پر اور باطن سے بڑھ کر ظاہر پر ہو گیا۔ نتیجۃً قرآنِ حکیم کے بھی منبعِ ایمان اور سرچشمۂ یقین ہونے کی حیثیت مؤخّر اور نگاہوں سے اوجھل ہوتی چلی گئی اور کتابِ قانون اور ریکے از ادلّۂ اربعہ[1] ہونے کی حیثیت مقدّم اور مرکزِ توجّہ بنتی چلی گئی۔ اور پھر جیسے جیسے مملکت اور سلطنت کے تقاضے پھیلتے گئے اور قانون کی عملداری وسیع ہوتی گئی قرآن مجید تو چار میں کے ایک کی حیثیت میں پس منظر میں گم[2] ہوتا چلا گیا اور توجّہات حدیث اور فقہ پر مرتکز ہو کر رہ گئیں[3]۔ ستم بالائے ستم یہ کہ علم اور حکمت کے میدان میں جو خلا اس طرح پیدا ہوا اُسے پُر کرنے کے لیے مصر و یونان کی جانب سے فلسفہ و منطق کی آندھیاں آئیں۔ نتیجۃً پورا عالمِ اسلام ارسطو کی منطق اور نو افلاطونی

---

[1] اصول شریعت چار ہیں: قرآنؔ، سُنّتِ رسولؐ، قیاسؔ، اجماعؔ انہیں اَدِلّۂ اَرْبَعہ کہا جاتا ہے۔

[2] حضرت اکبر کا بہت پیارا شعر ہے۔

صَوم ہے ایمان سے، ایمان غائب صَوم گم — قوم ہے قرآن سے قرآن رخصت قوم گمُ!

[3] چنانچہ اصولِ حدیث اور اصولِ فقہ پر تو بے شمار تصانیف ملتی ہیں لیکن اصول تفسیر کے موضوع پر چودہ سو سال میں کل دُو رسالے ملتے ہیں ایک امام ابن تیمیہؒ کا رسالہ 'اصُول تفسیر' اور دوسرا امام الہند شاہ ولی اللہ دہلوی کا رسالہ 'الفوز الکبیر'

تصوّف کی آماجگاہ بن کر رہ گیا۔ یہاں تک کہ فلسفہ و اصولِ اخلاق کے لیے بھی مسلمانوں کو اغیار کے سامنے کاسۂ گدائی پیش کرنے کے سوا کوئی چارہ نہ رہا[1]! اور رفتہ رفتہ صورت یہ ہوگئی کہ قرآن نہ منبعِ ایمان رہا نہ سرچشمۂ یقین اور نہ مخزنِ اخلاق رہا نہ معدنِ حکمت ـــــ بلکہ صرف ایک "ایسی کتابِ مقدس" بن کر رہ گیا جس کے الفاظ یا تو حصولِ برکت اور ایصالِ ثواب کا ذریعہ بن سکتے ہیں یا زیادہ سے زیادہ تعویذ گنڈے اور جھاڑ پھونک کے کام آسکتے ہیں[2]۔ اور اس طرح آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی وہ پیشین گوئی حرف بحرف پوری ہوئی کہ ایک زمانہ وہ آئے گا کہ:

لَا یَبْقٰی مِنَ الْاِسْلَامِ اِلَّا	اسلام میں سے سوائے اُس کے نام کے اور کچھ
اِسْمُہٗ وَلَا یَبْقٰی مِنَ الْقُرْاٰنِ	باقی نہ رہے گا اور قرآن میں سے سوائے
اِلَّا رَسْمُہٗ (مشکوٰۃ: کتاب العلم)	صورتِ الفاظ کے اور کچھ نہ بچے گا۔

بعینہٖ یہی معاملہ 'جہاد' کے ساتھ بھی ہوا، جب اصل زور ایمان پر نہ رہا بلکہ اسلام پر ہو گیا تو جہاد بھی جو ایمانِ حقیقی کا رُکنِ رکین تھا خود بخود نگاہوں سے اوجھل ہوتا چلا گیا۔ اور ساری توجہ ارکانِ اسلام پر مرتکز ہوگئی جن کی فہرست میں جہاد سرے سے شامل ہی نہیں ہے، گویا جہاد پر ظلم قرآن سے بھی بڑھ کر ہوا۔ اس لیے کہ قرآن تو خواہ 'چار میں کے ایک' کی حیثیت ہی سے سہی بہر حال شریعت کے اصولِ اربعہ میں شامل تو ہے، جہاد تو نہ صرف یہ کہ اسلام کے ارکانِ خمسہ میں شامل نہیں بلکہ نظامِ فقہ میں بھی اِس کی حیثیت فرضِ عین کی نہیں صرف فرضِ کفایہ کی ہے۔ اس پر مستزاد یہ کہ جہاد کا تصوّر بھی مسخ ہوگیا اور اس شجرۂ طیّبہ کی شاخوں کو جڑ اور تنے سے جدا کر کے ہر ایک کو مختلف رنگ دے دیا گیا چنانچہ ایک طرف جہاد مع النفس کا رُخ اعمال اور معاملات کی منجدھار سے پرے ہی پرے اذکار و اوراد اور نفسیاتی ریاضتوں اور ورزشوں کی راہِ لیسیر (SHORT-CUT) کے جانب موڑ دیا گیا اور دوسری طرف جہاد کو قتال کے ہم معنیٰ قرار دے کر اس کا مقصد مملکت کی سرحدوں کے تحفظ و دفاع اور بس چلے تو توسیع کے سوا کچھ نہ رہا۔ رہا شرک و ظلم، کفر و فسق اور زور و منکر کی ہر صورت کے ساتھ مسلسل کشمکش

---

[1] اسی کا مرثیہ کہا مولانا رومؒ نے ان الفاظ میں ؎

چند خوانی حکمتِ یونانیاں　　　حکمتِ قرآنیہ را ہم بخواں

[2] ایک تیسرا مصرف قرآن کا وہ ہے جو علامہ اقبالؒ نے اس شعر میں بیان کیا: ؎

بآیاتش ترا کارے جز ایں نیست　　　کہ از یاسینِ آساں بمیری

اور تصادُم اور حق و صداقت کے پرچار، نیکی اور راستبازی کی ترویج، کلمۂ توحید کی نشر و اشاعت اور دینِ حق کے غلبہ و اقامت کے لیے پیہم جِدّ و جُہد اور اس کے لیے سمع و طاعت کے اصُول پر مبنی نظامِ جماعت کے قیام کا معاملہ ـــــ گویا فی الجملہ احقاقِ حق اور ابطالِ باطل کی منظّم سعی جو ہر مومن کے لیے فرضِ عین کا درجہ رکھتی ہے تو وہ یا تو سرے سے خارج از بحث ہو گئی یا زیادہ سے زیادہ ایک اضافی نیکی قرار پا کر رہ گئی اور اس سے بالا ہی بالا اور ورے ہی ورے اسلام و ایمان اور تقویٰ و احسان کے جملہ مراحل طے پانے لگے!

اللہ! اللہ کوئی فرق سا فرق ہے اور تفاوت سا تفاوت! عؔ "ببیں تفاوتِ رہ از کجا است تا بہ کجا!" کے مصداق کجا وہ کیفیت کہ صحابہ کرامؓ جذبۂ جہاد سے سرشار، بیک زبان، رجزیہ انداز میں یہ شعر پڑھ رہے ہیں: نَحْنُ الَّذِيْنَ بَايَعُوْا مُحَمَّدًا

عَلَى الْجِهَادِ مَا بَقِيْنَا اَبَدًا

کجا یہ حال کہ چودھویں صدی ہجری کے ایک مُتنبّی اور اُس کی ذُرّیتِ صلبی و معنوی نے تو جہاد بالسّیف کو باقاعدہ منسُوخ ہی قرار دے دیا، مسلمانوں کی عظیم اکثریّت کا حال بھی عملاً کچھ زیادہ مختلف نہیں۔ عؔ

"کہ رہوارِ یقین ما بصحرائے گماں گم شد!"

ڈاکٹر اسرار احمد
کی تالیف
استحکامِ پاکستان
اشاعت خاص ۳۰ و ۲۰ روپے
اشاعت عام ۱۲/- روپے
قریبی بک سٹال سے طلب فرمائیں یا براہِ راست درج ذیل پتہ پر لکھیں
مکتبہ مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور ۳۶۔ کے ماڈل ٹاؤن
فون: ۸۵۲۶۱۱

پاکستان کیوں بنا ـــــ کیسے بنا
پاکستان کیوں ٹوٹا ـــــ کیسے ٹوٹا
اب ٹوٹا تو ــــــــ
پاکستان کی تاریخ کا حقیقت پسندانہ تجزیہ
اندھیروں میں اُمید کی ایک کرن
لفظ لفظ میں ـــــ وطن کی محبّت
سطر سطر میں ـــــ ایمان کی چاشنی
عمل کا پیغام ــــــــ

اس کتاب کا مطالعہ خود بھی کیجئے اور اسے زیادہ سے زیادہ عام کیجئے

افاداتِ فراہیؒ

ترجمہ: ڈاکٹر محمد اجمل اصلاحی

قرآن مجید کا طرزِ استدلال

[ترجمان القرآن علامہ حمید الدین فراہی رحمۃ اللہ علیہ کا یہ نادر مضمون جس کا اردو ترجمہ قارئین کی خدمت میں پیش کیا جا رہا ہے، مولانا عبد اللہ عمادی مرحوم کے عربی رسالہ البیان لکھنؤ میں ۲۹ ربیع الآخر ۱۳۲۶ھ کے شمارہ ۸ (جلد ۵) میں "محاجۃ الوحی" کے عنوان سے شائع ہوا تھا۔ علامہ کے قیام کراچی کا یہ آخری زمانہ تھا۔ علامہ فراہی کا انتقال ۱۹۳۰ء میں ہوا اس طرح یہ مضمون انتقال سے کم از کم پچیس سال قبل لکھا گیا تھا۔ مضمون کے مطالعہ سے خیال ہوتا ہے کہ شاید یہ علامہ کی نہایت اہم غیر مطبوعہ اور ناتمام کتاب "حجج القرآن" کی کوئی فصل ہوگی جس کا مسودہ دائرہ حمیدیہ سرائے میر۔ اعظم گڈھ میں محفوظ ہے

ترجمے پر مولانا امانت اللہ اصلاحی نے اپنی مصروفیات اور خرابی صحت کے باوجود بھرپور نظر ثانی نہ فرمائی ہوتی تو یہ اشاعت کے قابل نہ ہوتا۔ ہم اسے علی گڑھ (بھارت) کے ششماہی علمی مجلہ "علوم القرآن" کے شکریے کے ساتھ شائع کر رہے ہیں]

(۱)

نبی امت کے لیے باپ کی مانند ہوتا ہے، وہ امت پر غایت درجہ شفیق اور علم میں سب پر فائق ہوتا ہے۔ اسی لیے وہ امت کو ایک عام آدمی کی طرح مخاطب نہیں کرتا۔ اور جب قوم اپنی حماقت، تکبر اور ہٹ دھرمی کے سبب اس کی دعوت کا انکار کرتی ہے تو اسے بے حد رنج ہوتا ہے۔ نبی کا حال اس شفیق باپ کی طرح ہوتا ہے جو اپنے مریض بیٹے کو دوا دینا چاہتا ہے اور بیٹا دوا لینے کے بجائے باپ سے بحث کرتا ہے اور اس کی نصیحت پر توجہ نہیں کرتا۔ باپ کبھی نرمی سے سمجھاتا ہے، اور کبھی طرح دے جاتا ہے، کہ شاید خود باز آجائے۔ ایک بات کو ماننے سے انکار کرتا ہے تو باپ بحث و تردید کے دلدادہ مناظرہ باز کی طرح اس بات پر اصرار نہیں کرتا بلکہ اس کے سامنے کوئی اور دلیل پیش کرتا ہے کہ شاید وہ کارگر ہو۔ اگر تمہیں کسی باپ کو دیکھنے کا اتفاق ہوا ہو کہ وہ کس شفقت و محبت سے اپنے ضدی بیٹے کے ساتھ پیش آتا ہے، یا کسی مصلح کو کہ وہ کیسی ہمدردی اور دلسوزی سے اپنی بگڑی ہوئی قوم کی اصلاح کی کوشش کرتا ہے

تو کسی قدر اندازہ ہوگا کہ نبی کا رویہ اپنی امت کے ساتھ کیا ہوتا ہے۔

(۲)

اگر نبی کی تعلیمات تک عقل کی رسائی از خود ممکن ہوتی تو انبیاء کی ضرورت نہ تھی، اور اگر اس کی باتیں خلاف عقل اور بعید از عقل ہوتیں تو اوّلاً اس پر کم عقلوں کے سوا جو کسی معجزہ کو دیکھ کر صرف تقلید میں ایمان لائے ہوں، کوئی ایمان نہ لاتا۔ ثانیاً ان تعلیمات کو بقاء اور رسوخ حاصل نہ ہوتا۔ ثالثاً معجزہ پیش کرنے سے قبل نبی قوم کو قصوروار نہ ٹھہراتا۔ لیکن جب واقعہ یہ ہے کہ معجزہ پیش کرنے سے قبل قصوروار ٹھہرایا گیا، اور انبیاء کی تعلیمات پر اصحاب عقل ایمان لائے، نیز ان ارباب دانش کے دلوں میں انھیں رسوخ ملا جنھیں تقلید سے کوئی واسطہ نہ تھا۔ تو معلوم ہوا کہ انبیاء کی تعلیمات عقل کو اپیل کرتی تھیں، چنانچہ جب اس کے سامنے پیش کی جاتی تھیں تو ان کو اس طرح قبول کرتی تھی جیسے کسی کا محب و عزیز بھائی کسی دور دراز مقام سے اسے میوے بھیجے اور وہ مزے لے لے کر کھائے، ایمان کی حلاوت بھی ایسی ہی ہوتی ہے جس کا تجربہ ہر مومن کو ہوتا ہے۔

اوپر ہم نے یہ جو کہا کہ عقل کی از خود رسائی ان تعلیمات تک نہیں ہو سکتی تھی تو اس کا مطلب یہ نہیں کہ رسائی بالکل محال ہے۔ مقصود صرف یہ ہے کہ اسباب گمراہی کا ہر طرف دور دورہ ہوتا ہے اس لیے کہ دنیاوی زندگی پر مادی و حسی لذات و شہوات اور مصائب و آلام چھائے ہوتے ہیں، اور جس طرح آسمان اپنے تاروں کے ذریعہ کرۂ زمین کو روشن کرتا ہے، اسی طرح ایک روحانی آسمان اپنے تاروں کے ذریعہ دلوں کو منور کرتا ہے۔

(۳)

جس طرح انبیاء کے دلوں میں قبول وحی کی استعداد ہوتی ہے، اسی طرح ہمارے دلوں میں انبیاء کی تعلیمات کو قبول کرنے کی استعداد ہوتی ہے۔ یہ استعداد دراصل وہ تیز حس ہوتی ہے جس کی اساس محبت اور ہمہ گیر شفقت اور مہربانی پر ہے۔ اسی سے دل دنیا کی آلائشوں سے پاک ہوتا ہے، نعمتوں کا فیضان کرنے والی ذات کی جانب متوجہ ہوتا ہے، اور انسانوں کے لیے شفقت و محبت کا پیکر بن جاتا ہے۔ کیونکہ اسے نعمتوں کا عرفان حاصل ہوتا ہے، اور اس کے نتیجہ میں شکر و احسان کے جذبات اس طرح امنڈ آتے ہیں جیسے چھاتی لبریز ہو جائے اور اس سے دودھ پھوٹ پڑے۔ یہی سبب ہے کہ فیاضی اور دریا دلی بلکہ انسانوں سے عشق سب سے زیادہ انبیاء کرام میں ہوتا ہے، اسی طرح ایمان لانے میں سبقت وہ لوگ کرتے ہیں جو سب سے زیادہ رحمدل

ہوتے ہیں۔ مومنین کی صفت بھی یہ بتائی گئی ہے کہ وہ نرم خو اور خاکسار ہوتے ہیں۔

(۴)

نبی اپنی دعوت میں اسی حس کو مرکز توجہ بناتا ہے، اور انسانوں کو دعوت دیتا ہے کہ وہ اللہ کی نعمتوں پر جن سے کائنات کا کوئی گوشہ خالی نہیں اور خود اپنی ذات پر غور کریں۔ نعمتوں پر یہ غور و فکر اس میثاق کا نقطۂ آغاز ہے جس کی بنیاد پر بندوں کا معبود سے رشتہ قائم ہوا ہے۔ اسی میثاق سے نبی کی تعلیم کی ابتدا ہوتی ہے، یہ میثاق نبی کے نزدیک واضح ترین حقیقت ہوتی ہے چنانچہ وہ اسے دلائل سے ثابت کرنے کی کوشش نہیں کرتا، بلکہ مسلمہ اصول کی طرح اسے بنیاد بنا کر اپنی دعوت شروع کرتا ہے۔ ارشاد ہے:

وَمَا لَكُمْ لَا تُؤْمِنُونَ بِاللّٰهِ وَالرَّسُوْلُ	اور تمہیں کیا ہو گیا ہے کہ تم اللہ پر ایمان نہیں
يَدْعُوْكُمْ لِتُؤْمِنُوْا بِرَبِّكُمْ وَقَدْ	لاتے، درانحالیکہ رسول بھی تم کو تمہارے رب پر
اَخَذَ مِيْثَاقَكُمْ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ	ایمان لانے کی دعوت دے رہا ہے، اور وہ
(حدید: ۸)	تم سے مضبوط عہد لے چکا ہے اگر تم مومن ہو

اس آیت میں بجائے اس کے کہ دلیل سے ثابت کیا جاتا کہ کوئی عہد مخاطب سے لیا گیا تھا صرف اس کی خبر دی گئی اور فرمایا: "اگر تم مومن ہو"

اس کے بعد فرمایا ہے:

هُوَ الَّذِيْ يُنَزِّلُ عَلٰى عَبْدِهٖٓ	وہی ہے جو اپنے بندے پر واضح آیات
اٰيٰتٍۭ بَيِّنٰتٍ لِّيُخْرِجَكُمْ مِّنَ	نازل کرتا ہے تاکہ تمہیں تاریکیوں سے نکال کر
الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ ۭ وَاِنَّ اللّٰهَ	روشنی کی طرف لائے اور بے شک اللہ تم
بِكُمْ لَرَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ ۝ (حدید: ۹)	پر نہایت ہی شفیق اور مہربان ہے۔

یہاں اللہ تعالیٰ نے صرف اپنی رأفت و رحمت کا ذکر کیا جو انھیں اپنی آغوش میں لیے ہوئے ہے اور فرمایا کہ وہ جہالت کی تاریکیوں میں بھٹک رہے ہیں اور اللہ تعالیٰ انھیں علم و معرفت کی روشنی میں لانا چاہتا ہے۔ یہاں اس کے علاوہ کوئی دلیل نہیں دی۔ البتہ میثاق کا ذکر پہلے ہو چکا ہے۔ گویا جو شخص یہ محسوس نہ کرے کہ اس کا اپنے رب کے ساتھ کوئی عہد و پیمان ہے وہ اس لائق نہیں کہ اسے مخاطب کیا جائے، جیسے کوئی شخص مسلمہ اصولوں کا انکار کر دے، ظاہر ہے ہر علم کے کچھ مسلمہ اصول و مبادی ہوتے ہیں اور ان کو تسلیم کیے بغیر کوئی گفتگو نہیں کی جا سکتی۔

پھر اہل نور اور اہل ظلمت کے حال کی تصویر کشی کے بعد فرمایا:

اَلَمْ یَاْنِ لِلَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اَنْ	کیا ان لوگوں کے لیے جو ایمان لائے وہ وقت
تَخْشَعَ (ای تسھل وتلین)	نہیں آیا کہ ان کے دل اللہ کے ذکر اور جو
قُلُوْبُهُمْ لِذِكْرِ اللّٰهِ وَمَا	حق نازل ہوا ہے اس کے لیے نرم ہو جائیں
نَزَلَ مِنَ الْحَقِّ (الذی واضح	(جو بذات خود بالکل واضح ہے) اور ان لوگوں
بنفسہ) وَلَا یَكُوْنُوْا كَالَّذِیْنَ	کی طرح نہ بن کے رہ جائیں جن کو اس سے
اُوْتُوا الْكِتٰبَ مِنْ قَبْلُ فَطَالَ	پہلے کتاب دی گئی پس ان پر طویل مدت گزر
عَلَیْهِمُ الْاَمَدُ فَقَسَتْ	گئی۔ بالآخر ان کے دل سخت ہو گئے اور
قُلُوْبُهُمْ وَكَثِیْرٌ مِّنْهُمْ	ان میں سے اکثر نافرمان ہیں۔ یاد رکھو کہ اللہ
فٰسِقُوْنَ ۝ اِعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ	زندہ کرتا ہے زمین کو اس کے مردہ ہو جانے
یُحْیِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا	کے بعد۔ ہم نے تمہارے لیے اپنی آیات
قَدْ بَیَّنَّا لَكُمُ الْاٰیٰتِ لَعَلَّكُمْ	واضح طور سے بیان کر دی ہیں تاکہ تم سمجھ بوجھ
تَعْقِلُوْنَ ۝ (حدید: ۱۶-۱۷)	سے کام لو۔

ان آیات میں اللہ تعالیٰ نے اپنی سنت کی ایک مثال پیش کی کہ جس طرح وہ مردہ زمین کو زندہ کر دیتا ہے اور وہ لہلہا اٹھتی ہے اور خیر و برکت کا سامان بن جاتی ہے، اسی طرح وہ دلوں کو زندہ کرتا ہے۔ پھر ان لوگوں کا حال بیان کیا جو اللہ کی راہ میں انفاق اور بندگان خدا سے ہمدردی و مواسات کے صلہ میں روحانی زندگی اور نور سے بہرہ مند ہوئے۔ اس کے بعد دنیاوی زندگی کی حقیقت بیان فرمائی جو اسباب ظلمت سے بھری ہوئی ہے اور فریب ہی فریب ہے۔ اور یہ کہ اللہ تعالیٰ انھیں جنت کی وسعتوں کی طرف بلاتا ہے۔ فرمایا:

اِعْلَمُوْٓا اَنَّمَا الْحَیٰوةُ الدُّنْیَا	جان لو کہ دنیا کی زندگی لہو و لعب، زینت و
لَعِبٌ وَّلَهْوٌ وَّزِیْنَةٌ وَّتَفَاخُرٌۢ	آرائش، فخر و مباہات اور زیادہ سے
بَیْنَكُمْ وَتَكَاثُرٌ فِی الْاَمْوَالِ	زیادہ مال و اولاد حاصل کرنے کی حرص کا
وَالْاَوْلَادِ كَمَثَلِ غَیْثٍ اَعْجَبَ	نام ہے۔ اس کی مثال ایسی ہی ہے جیسے
الْكُفَّارَ نَبَاتُهٗ ثُمَّ یَهِیْجُ	بارش ہو اور اس کی لہلہاتی ہوئی فصل کفار
فَتَرٰىهُ مُصْفَرًّا ثُمَّ یَكُوْنُ	کو فریفتہ کر دے۔ پھر وہ خشک ہو جائے اور

حُطَامًا ۭ وَفِي الْاٰخِرَةِ عَذَابٌ	تم اسے زرد دیکھو پھر وہ ریزہ ریزہ ہو جائے۔
شَدِيْدٌ ۙ وَّمَغْفِرَةٌ مِّنَ اللّٰهِ وَ	اور آخرت میں ایک عذاب شدید بھی ہے
رِضْوَانٌ ۭ وَمَا الْحَيٰوةُ الدُّنْيَآ	اور اللہ کی طرف سے مغفرت اور خوشنودی
اِلَّا مَتَاعُ الْغُرُوْرِ ۝ سَابِقُوْٓا	بھی اور دنیا کی زندگی تو بس دھوکے کا سامان ہے۔
اِلٰى مَغْفِرَةٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَجَنَّةٍ	تم مسابقت کرو اپنے رب کی مغفرت اور
عَرْضُهَا كَعَرْضِ السَّمَآءِ	ایک ایسی جنت کی طرف جس کی وسعت
وَالْاَرْضِ اُعِدَّتْ لِلَّذِيْنَ	آسمان و زمین کی وسعت کے مانند ہوگی۔
اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَرُسُلِهٖ ۭ ذٰلِكَ	وہ تیار کی گئی ہے ان لوگوں کے لیے جو اللہ
فَضْلُ اللّٰهِ يُؤْتِيْهِ مَنْ يَّشَاۗءُ ۭ	اور اس کے رسولوں پر ایمان رکھتے ہیں۔ یہ
وَاللّٰهُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِيْمِ ۝	اللہ کا فضل ہے۔ وہ اپنا فضل جس کو
(حدید: ۲۰-۲۱)	چاہے بخشے اور اللہ بڑا ہی فضل والا ہے۔

آپ نے دیکھا کہ یہاں استدلال میں ان امور کے سوا کچھ ذکر نہیں کیا جو بالکل ظاہر اور دلیل سے بے نیاز ہیں۔ یہی "ذکر" کا مفہوم ہے، اور اسی حقیقت کی تعبیر دوسری جگہ یوں کی گئی ہے:

وَقُلْ لَّهُمْ فِيْٓ اَنْفُسِهِمْ قَوْلًۢا بَلِيْغًا (نساء: ۶۳)

یعنی ان سے ایسی بات کہو جو ان کے دلوں پر اثر انداز ہو، اور ان قلبی احساسات کو بیدار کرے جو ان میں ودیعت کیے گئے ہیں۔ معلوم یہ ہوا کہ نبی کا کام صرف "تذکیر" ہے اس کے بس میں یہ نہیں ہے کہ انسانوں کے دلوں میں از سر نو کسی چیز کو وجود بخشے۔ وہ انھیں حقائق کی یاددہانی کرتا ہے جو پہلے سے ان کے دلوں میں موجود ہیں لیکن ان پر غفلت و نسیان کے پردے پڑ گئے ہیں۔ اس بات کی صراحت قرآن مجید نے بھی کی ہے اور انجیل نے بھی اور ارباب دانش نے بھی اس کا ادراک کیا ہے۔

(۵)

یہی حقیقت ہے جسے حضرت سلیمان علیہ السلام نے یوں بیان کیا ہے کہ حکمت کا نقطۂ آغاز خشیت الٰہی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب عزیز کے شروع ہی میں فرمایا کہ وہ

هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ (بقرہ: ۱) ہدایت ہے اللہ سے ڈرنے والوں کے لیے۔

گویا جس شخص کے دل میں اللہ تعالیٰ کا خوف نہیں، شہوات میں متہمک ہے، دنیوی لذات

ہی اس کا مطمح نظر ہیں اس نے دین کی حس کھودی اور علم کے دروازے کو بند کر دیا۔ اس لیے اللہ نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم دیا کہ وہ لوگوں میں خشیت کی حس کو بیدار کریں۔ فرمایا:

وَذَكِّرْهُمْ بِأَيَّامِ اللَّهِ (ابراہیم:۵) اور اللہ کے عبرتناک ایام کا ذکر کر کے انھیں نصیحت کرو۔

اور اسی بنا پر اللہ تعالیٰ نے اپنی مقدس کتابوں میں عذاب کا ذکر کثرت کیا ہے تاکہ لوگوں کے اندر خشیت بیدار ہو، اور علم الٰہی کے لیے استعداد پیدا ہو۔ یہ خشیت ایسی چیز نہیں کہ اس سے عقل پر حجاب پڑ جائے بلکہ وہ عقل کو فکر و نظر پر آمادہ کرتی ہے۔ کیونکہ جسے غفلت کے انجام بد کا خوف نہ ہو وہ کسی کام کے لیے سنجیدگی سے جدوجہد نہیں کر سکتا۔ یہ خشیت علم و فہم کا نتیجہ ہوتی ہے، اس لیے کہ جس کے پاس علم نہیں ہوتا اسے کوئی اندیشہ نہیں ہوتا جیسے اندھا جو کسی گڑھے کے کنارے کھڑا ہو، اسے کچھ خبر نہیں کہ اس کے آگے کیا ہے، چنانچہ اسے کچھ پروا نہیں یہاں تک کہ وہ اس میں گر پڑتا ہے۔ الغرض جس طرح دلوں میں فضائل اور بلندی کی طرف رغبت کی حس ہوتی ہے اسی طرح رذائل اور پستی سے خوف کی بھی حس ہوتی ہے۔ نبی اسی حس کو بیدار کرتا اور جلا دیتا ہے تاکہ وہ اس حق مبین اور نور ہدایت کو قبول کر سکیں جو ان کے سامنے وہ پیش کرتا ہے۔

(۶)

سطور بالا میں جو کچھ بیان کیا گیا ہے اس پر اگر تم غور کرو گے تو اس سے دو باتیں واضح ہو کر سامنے آئیں گی:

اول یہ کہ انبیاء انسانوں کے سامنے واضح حقائق پیش کرتے ہیں، مگر اس طور پر کہ وہ انھیں فہم، بصیرت، یقین اور پورے اطمینان قلب سے قبول کریں۔

دوم یہ کہ وہ معجزے کا سہارا آخری علاج کے طور پر لیتے ہیں اور معجزہ کے مطالبہ سے انھیں رنج ہوتا ہے۔ اس لیے کہ وہ جانتے ہیں کہ معجزہ دلیل نہیں ہوا کرتا، اور جس شخص کے لیے حکیمانہ کلام اور حق مبین کارگر نہ ہو اس کے لیے معجزہ مفید ہو جائے اس کی توقع کم ہی ہوتی ہے۔ اسی لیے حضرت مسیح علیہ السلام کو دیکھو کہ ان لوگوں پر کس طرح برہم ہوئے جنھوں نے ان سے معجزہ کا مطالبہ کیا۔ اور ان منافقین پر کس طرح اظہار افسوس کیا جو کلام الٰہی کو سمجھنے کی کوشش نہیں کرتے، اسے تو پس پشت ڈال دیتے ہیں، اور معجزہ کا مطالبہ کرتے ہیں۔ اور یہی وجہ ہے کہ صالحین بغیر معجزہ کے ایمان لاتے ہیں۔

غرض وحی کا استدلال عقل وفہم کی بنیاد پر ہی ہوتا ہے۔ اسی لیے قرآن مجید میں تدبر اور تفکر کی تعریف کثرت سے آئی ہے۔ "تدبر" سے مراد فکر کو صحیح عقلی طریقہ پر استعمال کرنا ہے۔ "صحیح" اس لیے کہ ہر قوت کو غلط طریقہ سے بھی استعمال کیا جا سکتا ہے۔ (معجزہ کی بحث دوسرے مقدمہ میں آئے گی)[1]

(۷)

ہم یہاں قرآن مجید کے طرز استدلال کی چند مثالیں پیش کرتے ہیں تاکہ یہ معلوم ہو سکے کہ اس کے استدلال کا طریقہ کیا ہے۔ کیوں کہ تم استدلال میں ان اصطلاحات کے عادی ہو چکے ہو جو بعد میں وضع کی گئی ہیں، مثلاً دلیل، دعویٰ، اثبات وابطال، قضیہ، صغریٰ وکبریٰ وغیرہ اور قرآن کے فطری اور سادہ طرز استدلال سے مانوس نہیں ہو۔

پہلی مثال

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

يَا أَيُّهَا النَّاسُ إِنْ كُنْتُمْ فِي رَيْبٍ مِنَ الْبَعْثِ	اے لوگو اگر تم کو دوبارہ جی اٹھنے میں شک ہے۔

یہ تقریر دعویٰ ہے اس کے بعد دلیل ہے:

فَإِنَّا خَلَقْنَاكُمْ مِنْ تُرَابٍ ثُمَّ مِنْ نُطْفَةٍ ثُمَّ مِنْ عَلَقَةٍ ثُمَّ مِنْ مُضْغَةٍ مُخَلَّقَةٍ وَغَيْرِ مُخَلَّقَةٍ (الحج: ۵)	تو دیکھو کہ ہم نے تم کو مٹی سے پیدا کیا، پھر نطفہ کے ایک قطرہ سے، پھر بستہ خون، پھر ایک لوتھڑے سے، کسی کی صورت گری ہوتی ہے، کسی کی سرے سے صورت گری نہیں ہوتی۔

اس کے بعد متنبہ کیا کہ اللہ تعالیٰ حجت قائم کرنا چاہتا ہے، فرمایا:

لِنُبَيِّنَ لَكُمْ	تاکہ ہم تمہارے سامنے واضح کر دیں۔

---

[1] قرآنی موضوعات پر مولانا کے بیشتر رسائل دراصل ان کے مقدمۂ تفسیر "فاتحہ نظام القرآن" کے مختلف اجزاء ہیں جنھیں مطالب کی وسعت کی بنا پر مستقل کتابوں کی صورت دیدی گئی۔ معجزات کی بحث کے لیے یہاں جس مقدمہ کا حوالہ دیا گیا ہے، وہ فاتحہ نظام القرآن میں موجود نہیں ہے۔ البتہ اس موضوع پر مولانا کے خیالات ان کی کتاب "القائد الی عیون العقائد" مطبوعہ دائرہ حمیدیہ سے معلوم کیے جا سکتے ہیں۔ (مترجم)

پھر یوم بعث کی تاخیر کی وجہ سے منکرین کو اس کے بارے میں جو شبہ ہوتا ہے اس کے ازالہ کے لیے دوسری دلیل پیش کی:

وَنُقِرُّ فِي الْأَرْحَامِ مَا نَشَاءُ إِلَىٰ	اور ہم رحموں میں ٹھہرائے رکھتے ہیں جسے
أَجَلٍ مُّسَمًّى ثُمَّ نُخْرِجُكُمْ طِفْلًا	چاہتے ہیں ایک مدت معین کے لیے پھر
ثُمَّ لِتَبْلُغُوا أَشُدَّكُمْ وَمِنكُم	ہم تم کو ایک بچہ کی شکل میں برآمد کرتے ہیں۔
مَّن يُتَوَفَّىٰ وَمِنكُم مَّن يُرَدُّ	پھر تم کو کمال توانائی تک پہنچنے دیتے ہیں۔
إِلَىٰ أَرْذَلِ الْعُمُرِ لِكَيْلَا يَعْلَمَ	اور تم میں سے بعض پہلے ہی مرجاتے ہیں
مِن بَعْدِ عِلْمٍ شَيْئًا	اور بعض بے بسی کی آخری حد کو پہنچتے ہیں
(حج: ۵)	اور یہ نوبت آجاتی ہے کہ وہ سب کچھ جاننے کے بعد کچھ بھی نہیں جانتے۔

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے بیان فرمایا کہ اس نے اپنی خلقت کے لیے اوقات مقرر کیے ہیں، پھر جسے چاہتا ہے مقدم یا موخر کرتا ہے۔ اس میں وقوع قیامت کی بھی دلیل ہے کیونکہ ہر شر آمیز مخلوق کے لیے ایک متعین مدت مقرر ہے۔ اگر ایسا نہ ہو تو شر ہمیشہ باقی رہے گا اور وہ اعلیٰ خیر ظہور میں نہ آسکے گا جس کے لیے اس عالم کو بدیہی طور پر اس شکل میں پیدا کیا گیا ہے۔ یعنی اس میں خیر و شر دونوں کا وجود ہے اس لیے اسے ایک روز ضرور ختم ہونا ہے۔

پھر بعث بعد الموت پر ایک اور دلیل پیش کی، فرمایا:

وَتَرَى الْأَرْضَ هَامِدَةً فَإِذَا	اور تم زمین کو دیکھتے ہو کہ بے دم پڑی ہوئی
أَنزَلْنَا عَلَيْهَا الْمَاءَ اهْتَزَّتْ	ہے اور جب ہم اس پر پانی برسا دیتے ہیں
وَرَبَتْ وَأَنبَتَتْ مِن كُلِّ	تو اس میں جان آجاتی ہے اور ابھرتی ہے
زَوْجٍ بَهِيجٍ ۝	اور طرح طرح کے خوشنما نباتات اگانے لگتی ہے۔

تفصیل سے دلیل بیان کرنے کے بعد کلام نے اجمال کا رخ اختیار کرلیا، فرمایا:

(۱) ذَٰلِكَ بِأَنَّ اللَّهَ هُوَ الْحَقُّ (حج: ۶) یہ سب کچھ اس لیے ہے کہ اللہ ہی حق ہے۔

چنانچہ وہ کسی چیز کو بے کار اور بے مقصد پیدا نہیں کرتا۔

(۲) وَأَنَّهُ يُحْيِي الْمَوْتَىٰ (حج: ۶) اور وہ مردوں کو زندہ کرتا ہے

جیسا کہ اس نے تمہیں نطفہ سے پیدا کیا اور مردہ زمین کو زندہ کیا۔

(۳) وَاَنَّهٗ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ (حج:۶) اور وہ ہر چیز پر قادر ہے۔

کیونکہ حیات کو وجود بخشنا سب سے مشکل کام ہے۔ کوئی صنعت و قدرت اس سے بڑھ کر نہیں۔ اسی طرح کسی اور چیز پر تصرف کرنا اتنا مشکل نہیں جتنا موت پر۔ جس ذات کو موت پر تصرف کرنے کی قدرت حاصل ہو اور وہ زندگی بخشنے پر بھی قادر ہو اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ ہر چیز پر قادر ہے۔

(۴) وَاَنَّ السَّاعَةَ اٰتِیَةٌ لَّا رَیْبَ فِیْهَا (حج:۷) اور قیامت آکے رہے گی اس میں ذرا شبہ نہیں۔

جب تم نے دیکھ لیا کہ اللہ تعالیٰ کے افعال کے مختلف اوقات مقرر ہیں، اور یہ بھی معلوم ہو چکا کہ وہ حق ہے چنانچہ کوئی کام عبث نہیں کرتا، اور یہ کہ وہ قادر مطلق ہے اور اس کے ہر عمل میں حکمت پنہاں ہے تو اب قیامت کے بارے میں شبہ کی کیا گنجائش رہ جاتی ہے۔

(۵) وَاَنَّ اللّٰهَ یَبْعَثُ مَنْ فِی الْقُبُوْرِ (حج:۸) اور اللہ ان سب کو زندہ کر کے اٹھائے گا جو قبروں میں ہیں۔

یہ گذشتہ باتوں کا آخری نتیجہ ہے۔

استدلال کا فطری طریقہ یہی ہے، لیکن چونکہ تم ایسی اصطلاحات کے عادی ہو چکے ہو جو عام گفتگو اور بول چال کے طریقہ سے ہٹی ہوئی ہیں اس لیے تمہیں یہ خیال بھی نہیں گزرتا کہ بات استدلال کے طور پر کہی جا رہی ہے۔ پس تمہیں بحث اور گفتگو کے صحیح اور فطری انداز کو پیش نظر رکھنا چاہیئے۔

دوسری مثال

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

اِنَّ الَّذِیْنَ یَخْشَوْنَ رَبَّهُمْ بِالْغَیْبِ لَهُمْ مَّغْفِرَةٌ وَّاَجْرٌ کَبِیْرٌ ۝ (ملک:۱۲) بے شک جو اپنے رب سے ڈرتے ہیں غیب میں رہتے ہوئے ان کے لیے مغفرت اور ایک بہت بڑا اجر ہے۔

یہ دعویٰ کی تقریر ہوئی۔ اس کے بعد دلیل بیان کی:

وَاَسِرُّوْا قَوْلَكُمْ اَوِ اجْهَرُوْا بِهٖ اور تم اپنی بات کو چھپاؤ یا ظاہر کرو۔ وہ تو دلوں

اِنَّهٗ عَلِیْمٌۢ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ (ملک:۱۳) کے بھیدوں سے بھی باخبر ہے۔

یعنی جب وہ تمہارے ظاہر و باطن دونوں سے باخبر ہے تو کیوں کر تمہارے اعمال کے مطابق تمہیں بدلہ نہ دے گا؟

پھر اس بات کی بھی دلیل دی کہ وہ دلوں کے رازوں سے باخبر ہے، فرمایا:

اَلَا یَعْلَمُ مَنْ خَلَقَ وَهُوَ اللَّطِیْفُ الْخَبِیْرُ ۝ (ملک:۱۴) — کیا وہ نہ جانے گا جس نے پیدا کیا ہے، وہ تو بڑا ہی باریک بیں اور حقیقت کی خبر رکھنے والا ہے۔

یہ ایک بدیہی دلیل ہے۔ اس لیے کہ خالق نے جو چیز اپنے ارادہ اور حکمت سے پیدا کی وہ اس کے بارے میں ضرور باخبر ہوگا۔ "خلق" محض اس کا نام نہیں کہ کچھ اجزا کو مرکب کر دیا جائے بلکہ یہ ایک ایسا عمل ہے جو مخلوق کے تمام گوشوں میں مسلسل جاری رہتا ہے۔ اگر ایسا نہ ہو تو "خلق" نہ کہیں گے۔ "وھو اللطیف الخبیر" میں اس حقیقت کو واضح کیا گیا ہے۔ "لطیف" میں یہ پہلو ہے کہ چھوٹی سی چھوٹی چیز بھی اس کی نگاہ سے اوجھل نہیں ہوتی۔ اور "خبیر" کا مفہوم یہ ہے کہ مخفی ترین چیز بھی اس کے دائرہ علم سے باہر نہیں ہوتی۔

تیسری مثال

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

یَا دَاوٗدُ اِنَّا جَعَلْنٰكَ خَلِیْفَةً فِی الْاَرْضِ فَاحْكُمْ بَیْنَ النَّاسِ بِالْحَقِّ ۝ (ص ۲۶) — اے داؤد ہم نے تم کو زمین میں خلیفہ بنایا تو لوگوں کے درمیان حق کے ساتھ حکومت کرو۔

اس لیے کہ خلیفہ کے لیے ضروری ہے کہ وہ اپنے آقا کے طریقہ کی پیروی کرے۔ اس کی وضاحت یوں فرمائی:

وَلَا تَتَّبِعِ الْهَوٰى فَیُضِلَّكَ عَنْ سَبِیْلِ اللّٰهِ (ص:۲۶) — اور خواہش کی پیروی نہ کرنا کہ وہ تمہیں اللہ کے راستہ سے ہٹا دے۔

یعنی حق کے راستہ سے

اِنَّ الَّذِیْنَ یَضِلُّوْنَ عَنْ سَبِیْلِ اللّٰهِ لَهُمْ عَذَابٌ شَدِیْدٌۢ بِمَا — جو لوگ اللہ کی راہ سے بھٹک جاتے ہیں ان کے لیے سخت عذاب ہے اس وجہ سے کہ

نَسُوْا يَوْمَ الْحِسَابِ (ص: ۲۶) انھوں نے روزِ حساب کو بھلا دیا۔

اور اسی وجہ سے اتباعِ حق سے غفلت ہوئی۔ کیونکہ اس روز احقاقِ حق ہوگا، حکمِ الٰہی کا ظہور ہوگا اور بندوں سے اختیارات سلب کر لیے جائیں گے۔ جس شخص نے اس حقیقت کو فراموش کر دیا اس نے یہ گمان کیا کہ اس دنیا میں حق کی کارفرمائی نہیں ہے اور ہر طرف باطل ہی کا دور دورہ ہے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے اس غلط فہمی کے ازالہ کے لیے فرمایا کہ اس عالم میں بھی اور آخرت میں بھی اللہ تعالیٰ کی طرف سے حق ہی کی کارفرمائی ہے۔ ارشاد ہوا:

وَمَا خَلَقْنَا السَّمَآءَ وَالْاَرْضَ	اور ہم نے آسمان اور زمین اور ان کے درمیان
وَمَا بَيْنَهُمَا بَاطِلًا ذٰلِكَ ظَنُّ	کی چیزیں عبث نہیں پیدا کی ہیں۔ یہ ان لوگوں
الَّذِيْنَ كَفَرُوْا فَوَيْلٌ لِّلَّذِيْنَ كَفَرُوْا	کا گمان ہے جنھوں نے کفر کیا تو ان کافروں
مِنَ النَّارِ ۝ اَمْ نَجْعَلُ الَّذِيْنَ	کی بربادی کے لیے دوزخ ہے۔ کیا ہم ان
اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ	لوگوں کو جو ایمان لائے اور عمل صالح کیا اور
كَالْمُفْسِدِيْنَ فِي الْاَرْضِ اَمْ	ان کو جو دنیا میں فساد مچاتے ہیں یکساں کر دیں
نَجْعَلُ الْمُتَّقِيْنَ كَالْفُجَّارِ ۝ (ص: ۲۷، ۲۸)	گے؟ یا متقیوں اور فاجروں کو یکساں کر دیں گے؟

اور یہ باطل ہے کیونکہ اس کا تقاضا یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ یا تو عاجز و بے بس ہے یا شر پر راضی۔ اللہ تعالیٰ کی ذات ان دونوں باتوں سے بلند و برتر ہے۔ اس حصہ کو یہاں ذکر نہیں کیا کہ مذکورہ بالا باتوں سے خود واضح ہوتا ہے۔ پھر متنبہ کیا کہ یہ بات بطور استدلال کہی گئی ہے۔ فرمایا:

كِتٰبٌ اَنْزَلْنٰهُ اِلَيْكَ	یہ ایسی کتاب ہے جو ہم نے تم پر اتاری ہے،
مُبٰرَكٌ لِّيَدَّبَّرُوْٓا اٰيٰتِهٖ	بابرکت ہے اس لیے ہے کہ لوگ اس کی
وَلِيَتَذَكَّرَ اُولُوا الْاَلْبَابِ ۝	آیات پر تدبر کریں اور صاحب عقل
(ص: ۲۹)	اس سے سبق حاصل کریں۔

اس طرح قرآن مجید اکثر اپنے دلائل پر متنبہ کرتا رہتا ہے۔

قرآن کے طریقِ استدلال کو سمجھنے کے لیے میرے خیال میں اتنی وضاحت کافی ہے۔

سترِ عیشِ جاوداں خواہی بیا ہم زمیں ہم آسماں خواہی بیا
پیرِ گردوں با من ایں اسرار گفت از ندیماں رازہا نتواں نہفت

حکمتِ اقبال

کلامِ اقبال کی روشنی میں اقبال کے فلسفۂ خودی کی مفصل اور منظم تشریح

محمد رفیع الدین
ایم۔ اے۔ پی۔ ایچ۔ ڈی۔ ڈی۔ لٹ

حکمتِ اقبال پر ایک عمومی نظر

حکمتِ اقبال میں تصوّرِ خودی کا مقام

اقبال کے تمام حکیمانہ افکار کا سرچشمہ صرف ایک تصوّر ہے جسے اقبال نے خودی کا نام دیا ہے اقبال کے اور تمام تصوّرات اسی ایک تصوّر سے ماخوذ ہیں اور اُس سے علمی اور عقلی طور پر وابستہ ہیں اس کا مطلب یہ ہے کہ اقبال کے تمام تصوّرات خود ایک دوسرے کے ساتھ بھی ایک علمی اور عقلی رشتہ میں منسلک ہیں اور اقبال کا فکر ایک ایسے نظامِ حکمت کی صورت میں ہے جس کا ہر تصوّر دوسرے تمام تصوّرات سے علمی اور عقلی تائید اور توثیق حاصل کرتا ہے جب تک ہم اس نظامِ حکمت کے مرکز یعنی تصوّرِ خودی کو ٹھیک طرح سے نہ سمجھیں ہم اقبال کے کسی تصوّر کو بھی ٹھیک طرح سے نہیں سمجھ سکتے اور اس کے برعکس جب تک ہم اقبال کے ہر تصوّر کو جو اس کے نزدیک تصوّرِ خودی کے حاصلات یا مضمرات میں سے ہے پوری طرح نہ سمجھ لیں ہم خودی کے تصوّر کو پوری طرح سے نہیں سمجھ سکتے اس کا مطلب یہ ہے کہ اقبال کو سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ ہم اس کے افکار کو الگ الگ کر کے اپنے غور و فکر کا موضوع نہ بنائیں بلکہ اس کے پورے فکر کا مطالعہ ایک کُل یا وحدت کی حیثیت سے کریں

ظاہر ہے کہ جب اقبال کا ہر تصوّر ایک پورے نظامِ فکر کا جزو ہے اور یہ پورا نظامِ فکر اس کی تشریح اور تفہیم کرتا ہے تو ہمارے لیے ضروری ہو جاتا ہے کہ ہم اُسے اس نظام کے جزو کی حیثیت سے ہی زیرِ غور لائیں۔ اگر ہم اس پورے نظامِ فکر سے الگ الگ کر کے یا اُس کے کسی حصّہ یا پہلو کو نظر انداز کر کے یا حذف کر کے یا غیر ضروری قرار دے کر اس پر غور کریں گے تو اس کے صحیح مفہوم پر حاوی نہ ہو سکیں گے۔ جب تک ہم اقبال کے کسی تصوّر کی ماہیّت کو اس کے پورے نظامِ فکر کی روشنی میں اور اس کے باقی ماندہ تمام تصوّرات کی مدد سے معین نہ کریں وہ ہمارا اپنا پسندیدہ تصوّر ہو تو ہو اقبال

کا تصوّر نہیں ہوسکتا۔ اقبال کا تصوّر تو وہی ہوسکتا ہے جس کی ماہیّت اس کے پُورے نظامِ فکر نے معین کی ہو جب ہم ایک نظامِ حکمت کے کسی جزو کو اس سے الگ کر دیں تو وہ اسی طرح سے مُردہ ہو جاتا ہے جس طرح جسمِ حیوانی کا ایک عضو جب جسم سے کاٹ دیا جائے تو مُردہ ہو جاتا ہے۔ یہ اصُول فہمِ اقبال کے لیے ایک کلید کا درجہ رکھتا ہے۔ اقبال کا مطالعہ کرنے والوں یا اقبال پر لکھنے والوں میں خواہ وہ مسلم ہوں یا غیر مسلم، پاکستانی ہوں یا غیر پاکستانی آج اقبال کے نظریات کے بارے میں جس قدر غلط فہمیاں پائی جاتی ہیں جس قدر مباحثے یا اختلافات موجود ہیں جس قدر نظریات کو نادانستہ طور پر اپنے اپنے خیالات کی تائید میں استعمال کرنے کی غلط کوششیں کی جا رہی ہیں اور اُن کے مفہوم کے اندر تضادات کے شبہات پیدا کیے جا رہے ہیں ان سب کا باعث یہی ہے کہ انہوں نے اس اصُول کو مدِّنظر نہیں رکھا۔

ایک ایسے فلسفہ کے اندر جس کے تمام تصوّرات صرف ایک ہی مرکزی یا بنیادی تصوّر سے ماخوذ ہوں حقیقی تضادات کا ہونا ناممکن ہے ایسی حالت میں تضاد پڑھنے والے کے ذہن میں تو ہوسکتا ہے لیکن فلسفی کے ذہن میں نہیں ہوسکتا۔ روضۂ تاج محل ایک خوبصورت کُل یا وحدت ہے جس میں کہیں کوئی تضاد موجود نہیں اور جس کی ہر اینٹ اس کی پُوری وحدت کے ساتھ ہم آہنگ ہے لیکن فرض کیا کہ کسی حادثہ کی وجہ سے اس کے بیسیوں ٹکڑے ہو جاتے ہیں جو دُور دُور بکھر جاتے ہیں اگر وہاں سے کوئی ایسا شخص گزرے جس نے روضۂ تاج محل کو ایک مربُوط اور منظم کُل کے طور پر کبھی نہ دیکھا ہو تو شاید وہ بعض ٹکڑوں کے باہمی ربط کو سمجھ جائے لیکن بہت سے ٹکڑے ایسے ہوں گے جن کو وہ بے معنی اور بے ربط سمجھنے پر مجبور ہوگا حالانکہ ان میں سے کوئی ٹکڑا بھی ایسا نہ ہوگا جو اس ٹوٹ پھوٹ جانے والی خوبصورت عمارت کے کسی نہ کسی کونہ میں اپنی جگہ نہ رکھتا ہو۔ اقبال کے فلسفہ کا حال بھی ایسا ہی ہے اس کے تمام تصوّرات اس کے اندر اپنا عقلی ربط اور ضبط رکھتے ہیں لیکن موجودہ صُورت میں بکھرے ہوئے پڑے ہیں۔ ہم اقبال کے فلسفہ میں تضاد کا شبہ صرف اسی موقع پر کر سکتے ہیں جہاں ہم اس کے کسی تصوّر کو اس حد تک نہ سمجھ سکیں کہ ہمیں معلوم ہو جائے کہ اس کے بنیادی یا مرکزی تصوّر خودی کے ساتھ اُس کا عقلی اور علمی ربط کیا ہے اور لہٰذا اس کے پُورے فلسفہ میں اس کا مقام یا محل کیا ہے۔ ظاہر ہے کہ جب اقبال کے اوسط درجہ کے مطالعہ کرنے والے کے پاس اقبال کا فلسفہ منظم صورت میں موجُود نہ ہوگا تو دورانِ مطالعہ میں اس کے لیے بارہا اس قسم کے مواقع کا پیش آنا ضروری ہے۔ اس سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ اقبال کے فلسفہ کو منظم اور مربُوط

شکل میں پیش کرنا اقبال کی تشریح اور تفہیم کے لیے کس قدر ضروری ہے۔

حکمت کی نوعیّت اور ضرُورت

سوال پیدا ہوتا ہے کہ خود فکر یا حکمت کی نوعیّت کیا ہے اور ہمیں اس کی ضرورت کیا ہے؟ اور پھر اقبال کا فکر ایک نظام حکمت کی صورت میں کیوں ہے؟ اقبال نے ایک ہی حقیقت پر اپنے افکار کی بنیاد کیوں رکھی ہے؟ کیا اقبال کا یہ طرزِ عمل ضروری تھا یا محض اتفاقی ہے اور خود اقبال کے فکر کی اہمیّت کیا ہے کہ اس کی تنظیم اور تشریح اور تفہیم ضروری سمجھی جائے۔ ہم شاید اس سوال کو نظرانداز کر دیتے لیکن حکمت اقبال کی منظم تشریح کے لیے اس سوال کا اُٹھانا اور اس کا جواب دینا ضروری ہے۔

جب سے انسان نے ہوش سنبھالا ہے وہ برابر اس کوشش میں لگا ہوا ہے کہ جس کائنات میں وہ آنکلا ہے اس کی حقیقت معلوم کرے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ جب تک اس کائنات کی حقیقت معلوم نہ ہو وہ جان نہیں سکتا کہ خود اس کی حقیقت کیا ہے۔ اور کائنات کے ساتھ اس کا تعلّق کیا ہے۔ کائنات کی حقیقت سے اُسے اپنی حقیقت کا سُراغ ملتا ہے کیونکہ وہ خود بھی کائنات کا ایک اہم جزو ہے اور اپنی حقیقت وہ اس لیے جاننا چاہتا ہے تاکہ اُسے معلوم ہو جائے کہ اسے اپنی زندگی کا استعمال کس طرح کرنا چاہیے۔ اس کی زندگی کا اصل مقصد کیا ہے اور وہ اپنی عملی زندگی کی تشکیل اور تعمیر کس طرح سے کرے کہ اس سے اپنے لیے اسی دنیا میں یا اگلی دنیا میں (اگر وہ بھی ہو تو) بہترین قسم کے نتائج اور ثمرات حاصل کر سکے۔ وہ جانتا ہے کہ اگر وہ کائنات کے متعلق ہر قسم کے ممکن سوالات کا تسلّی بخش جواب حاصل کر لے گا تو اسی جواب میں اسے اپنے متعلق ہر قسم کے ممکن سوالات کا تسلّی بخش جواب بھی مل جائے گا اور پھر وہ اس جواب کی روشنی میں اپنے تمام مسائل کا صحیح حل معلوم کر سکے گا اور اپنی زندگی کا استعمال صحیح طریق سے کر سکے گا۔ یہی وجہ ہے کہ کائنات کی حقیقت کا جو تصوّر بھی وہ قائم کرتا ہے وہ اپنی عملی زندگی کو نہایت احتیاط کے ساتھ اس کے مطابق بناتا ہے گویا اس کے لیے حقیقت کائنات کی تلاش نہ تو کوئی تفریحی مشغلہ ہے اور نہ ہی کوئی علمی یا نظری مسئلہ بلکہ ایک شدید عملی ضرورت ہے جس کی اچھی یا بُری تشفی اس کی روزمرہ کی زندگی کے تمام حالات اور اس کی تمام چھوٹی اور بڑی تفصیلات کو معین کرتی ہے۔ بدنی ضروریات کی تشفی کو تو ہم ایک عرصہ تک التوا میں بھی ڈال سکتے ہیں لیکن اگر ہم اس ذہنی اور عملی ضرورت

کو ایک لمحہ کے لیے بھی ملتوی کر دیں تو ہمارا دماغی توازن بگڑنے لگتا ہے اور ہم جنون، ہسٹیریا، خوف، غم، پریشانی ایسے ذہنی امراض کا شکار ہونے لگتے ہیں۔ حکمتِ اقبال کی اہمیت اسی بنا پر ہے کہ ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ آیا یہ وہی حکمت ہے جو انسان کی شدید ذہنی اور عملی ضرورت کو پورا کرتی ہے یا نہیں۔

حکمت کی عمومیّت

یہ کہنا غلط ہے کہ حقیقتِ کائنات کے تصوّرات یا نظریات حکما یا فلاسفہ سے مخصوص ہوتے ہیں۔ دراصل انسان کی اس طرح سے بنی ہے کہ آج تک کوئی تندرست فردِ عالم یا جاہل ایسا نہیں ہوا اور نہ آئندہ ہو سکتا ہے جو حقیقتِ کائنات کا کوئی اچھا یا بُرا، صحیح یا غلط مختصر یا مفصّل منظم یا غیر منظم، عالمانہ یا جاہلانہ تصوّر نہ رکھے اور اپنی ساری عملی زندگی کو اس کے مطابق نہ بنائے۔ حکما یا فلاسفہ صرف وہ لوگ ہوتے ہیں جو اور لوگوں کی نسبت زیادہ ذہین اور زیادہ باریک بین ہوتے ہیں اور اپنے ذوق اور اپنی افتادِ طبیعت کے لحاظ سے حقیقتِ کائنات کے مسئلہ پر غور و خوض کرنے اور اس کو سمجھنے اور سمجھانے کے لیے زیادہ موزوں اور مستعد ہوتے ہیں جس طرح سے بعض افرادِ عام لوگوں کے لیے غلّہ پیدا کرنے یا کپڑا بننے یا اور بدنی ضروریات کی چیزیں تیار کرنے میں لگے رہتے ہیں۔ اسی طرح سے نوعِ بشر کے حکما اور فلاسفہ عام لوگوں کی سب سے بڑی ضرورت کی چیز یعنی حقیقتِ کائنات کا صحیح تصوّر جو ہماری ذہنی اور روحانی سطح کی ضروریات سے تعلّق رکھتا ہے بہم پہنچانے میں لگے رہتے ہیں۔ ان کی کوشش یہ ہوتی ہے کہ حقیقتِ کائنات کے متعلق خود ان کا اور دوسرے لوگوں کا تصوّر زیادہ سے زیادہ صحیح ہو تاکہ وہ خود اور دوسرے لوگ اپنی عملی زندگی کو زیادہ سے زیادہ صحیح بنا سکیں لیکن حقیقتِ کائنات کے تصوّر کی ضرورت ہر انسان کے لیے اس قدر شدید اور فوری اور ناقابلِ التوا ہوتی ہے کہ لوگ کبھی فلسفیوں اور حکیموں کی تحقیق اور تجسّس کے ایسے نتائج کا انتظار نہیں کرتے جو آئندہ کسی وقت دستیاب ہونے والے ہوں بلکہ جو نظریات پہلے ہی موجود ہوتے ہیں ان میں سے کوئی نظریہ قبول کر کے اس پر عمل درآمد شروع کر دیتے ہیں اور وہی نظریہ اپنی اولادوں کو وراثت میں سونپ جاتے ہیں لیکن اگر بعد میں آنے والی نسلیں کسی اور

نظریہ سے جو کسی اور حکیم یا فلسفی نے پیش کیا ہو متاثر ہو جائیں تو اپنے نظریہ کو بدل لیتی ہیں اور پھر ان کی ساری انفرادی اور اجتماعی زندگی اس کے مطابق بدل جاتی ہے تاریخ کے بڑے بڑے انقلابات اسی طرح داناؤں، فلسفیوں اور حکیموں کے نظریات سے پیدا ہوئے ہیں۔

وحدتِ کائنات

حکما اور فلاسفہ ہر دور میں پیدا ہوتے رہتے ہیں اور ان میں سے جو بعد میں آتے ہیں، اپنے متقدمین کے فکر کی غلطیاں نکالنے اور درست کرنے کی کوشش کرتے رہتے ہیں۔ اس طرح سے ان کے اختلافات کا سلسلہ جاری رہتا ہے اگرچہ فلسفیوں اور حکیموں کا پورا گروہ ابھی تک حقیقتِ کائنات کا صحیح تصور پیش کرنے سے قاصر رہا ہے تاہم جب سے اس گروہ نے حقیقتِ کائنات پر غور و خوض شروع کیا ہے، اس وقت سے لے کر آج تک ایک پُراسرار وجدانی شہادت کی بنا پر اس بات کا پختہ یقین ان پر غالب رہا ہے کہ کائنات ایک یکساں کُل یا وحدت ہے یعنی وہ فاصلہ اور وقت دونوں کے اعتبار سے ایسے منطقوں یا حصّوں میں بٹی ہوئی نہیں جن میں متضاد قسم کے قوانینِ قدرت جاری ہوں۔ کائنات کے قوانین مسلسل اور مستقل ہیں۔ وہ نہ صرف ہر جگہ پر ایک ہی رہتے ہیں بلکہ ہر زمانہ میں بھی ایک ہی رہتے ہیں۔ وحدتِ عالم کا یہ وجدانی اعتقاد تمام بڑے بڑے حکیموں، فلسفیوں اور سائنسدانوں کے فکر میں خواہ وہ تصوریّت پرست ہوں یا مادیّت پرست، ایک قدر مشترک کا حکم رکھتا ہے۔ اگرچہ کوئی بڑا فلسفی یا سائنسدان اس کی صحت کی دلیل طلب نہیں کرتا بلکہ آغاز ہی سے اسے اپنے مسلّمات میں شمار کرتا ہے تاہم اس کی صحت کی دلیل اس سے بڑھ کر اور کیا ہو گی کہ وہ آج تک غلط ثابت نہیں ہو سکا۔ سائنس اور فلسفہ کی تمام ترقیات جو اب تک وجود میں آئی ہیں، ان کی بنیاد یہی حقیقت ہے اور وہ سب مل کر اس کی صحت کی شہادت دیتی ہیں اور سچ بات تو یہ ہے کہ اگر جویانِ حق وصداقت اور طالبانِ علم وحقیقت اس عقیدہ سے آغاز نہ کرتے اور یہ عقیدہ صحیح نہ ہوتا کہ کائنات ایک وحدت ہے اور اس کی تعمیر کے اندر ایک تسلسل موجود ہے جو کہیں نہیں ٹوٹتا تو سائنس اور فلسفہ دونوں ممکن نہ ہوتے۔ یہی وہ عقیدہ ہے جو سائنسدان اور فلسفی دونوں کو اپنے اپنے دائرہ میں علمی تحقیق کے لیے اکساتا ہے اور اسی کی تصدیق سے وہ اپنی علمی تحقیق کے نتائج پر مطمئن ہوتے اور اس کی راہ پر قدم آگے بڑھاتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ اگر فلسفی

یا سائنسدان کو معلوم ہو جائے کہ جو علمی حقیقت اس نے دریافت کی ہے وہ محض وقتی اور مقامی ہے اور اس کی متبادل یا متوازی علمی حقیقتیں اس کائنات میں اور بہت سی ہیں یا آئندہ ہو سکتی ہیں (مثلاً یہ کہ پانی ایک ہی مقام پر کبھی ایک درجہ حرارت پر اُبلتا ہے اور کبھی دوسرے پر یا سطح سمندر سے ایک ہی بلندی پر کہیں ایک درجہ حرارت پر اُبلتا ہے کہیں دوسرے پر) تو وہ اپنی تحقیق کے اس نتیجہ کو بیکار سمجھ کر چھوڑ دیگا۔ مذہبی رجحان رکھنے والے ایک انسان کے لیے تو وحدتِ عالم کا نتیجہ ناگزیر ہے کیونکہ وہ سمجھتا ہے کہ کائنات کا خالق ایک ہی ہے اور اسی کا مقصد پوری کائنات میں کارفرما ہے۔ اسی طرح سے ایک تصوریت پرست فلسفی کا حکیمانہ زاویۂ نگاہ بھی اس عقیدہ کا تقاضا کرتا ہے لیکن یہ بات فطرت انسانی کے نہایت ہی اہم سربستہ رموز کو منکشف کرنے والی ہے کہ کارل مارکس اور اس جیسے دوسرے حکمائے مادیین بھی اس عقیدہ سے پہلو تہی نہیں کر سکے۔

وحدتِ کائنات کے مضمرات

وحدتِ کائنات کا مُسلّمہ ہمیں کئی نتائج کی طرف راہ نمائی کرتا ہے:۔

اوّل: کسی کثرت کے اندر وحدت کا ہونا نظم کے بغیر ممکن نہیں اور نظم ایک مرکزی اصُول کے بغیر محال ہے۔ لہٰذا کوئی تصور ایسا ہونا چاہیے جو کائنات کی وحدت کا اصُول ہو جو ایک ایسے رشتہ کی طرح ہو جو کائنات کی کثرت کو پرو کر ایک وحدت بناتا ہو۔

دوم: کائنات کی وحدت کے اصُول کو کائنات کی آخری اور بنیادی حقیقت ہونا چاہیے اور باقی تمام حقائق عالم کو اس کے مظاہر۔ کیونکہ اگر وہ اس حقیقت کے مظاہر نہ ہوں تو وہ ان میں اتحاد اور نظم پیدا نہیں کر سکتی اور نہ ہی وہ حقائق اپنی فطرت کے اختلافات کی وجہ سے اس قابل رہتے ہیں کہ ان میں اتحاد اور نظم پیدا کیا جا سکے۔

سوم: کائنات کی وحدت بطور وحدت کے عقلی طور پر سمجھ میں آنی چاہیے لہٰذا ضروری ہے کہ تمام حقائقِ عالم کائنات کی بنیادی حقیقت کے ساتھ اور ایک دوسرے کے ساتھ عقلی طور پر وابستہ ہوں اور اس باہمی وابستگی کے سبب سے ایک ایسی زنجیر کی صورت اختیار کریں جس کا پہلا اور آخری حلقہ کائنات کی وہی بنیادی حقیقت ہو اور جس کے تمام حلقے ایسے ہوں کہ ہر حلقہ اگلے حلقے کی

طرف راہ نمائی کر رہا ہو۔ حکما حقائق عالم کی ایسی ہی زنجیر کو نظامِ حکمت (PHILOSOPHICAL SYSTEM) کا نام دیتے ہیں۔

چہارم: اگر ہم حقائق عالم میں سے کسی حقیقت کی علت بیان کریں تو وہ علت اس حقیقت کی تشریح تو کر دیتی ہے لیکن خود کئی سوالات پیدا کر دیتی ہے اور پھر ان سوالات کا جواب اور سوالات پیدا کرتا ہے اور علیٰ ہذا القیاس یہ سلسلہ جاری رہتا ہے۔ اگر کائنات کو ایک وحدت مانا جائے تو ضروری ہے کہ ان پے در پے پیدا ہونے والے سوالات کا آخری جواب اور ہر حقیقت کی آخری تشریح کائنات کی وہی حقیقت ہو جو حقیقت الحقائق ہے۔

پنجم: اصولِ وحدتِ کائنات یا حقیقتِ کائنات کے ہزاروں تصوّرات ممکن ہیں لیکن ان میں صحیح تصوّر صرف ایک ہی ہو سکتا ہے۔ دو یا دو سے زیادہ نہیں ہو سکتے۔ کیونکہ اگر ایسا ہو تو کائنات کی وحدت ختم ہو جاتی ہے اور ضروری ہے کہ کائنات کے تمام صحیح اور سچے حقائق صرف اسی ایک تصوّر کے ساتھ علمی اور عقلی مطابقت رکھتے ہوں اور کسی دوسرے غلط تصوّر کے ساتھ مطابقت نہ کر سکیں اور جب کائنات کا صحیح نظامِ حکمت وجود میں آئے تو اس کا مرکزی اور بنیادی نقطہ یہی تصوّرِ حقیقت ہو۔ اگر کوئی ایک سچی حقیقت بھی ایسی ہو جو کسی نظامِ حکمت کے ساتھ مطابقت نہ رکھے تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ وہ نظامِ حکمت کسی غلط تصوّرِ حقیقت پر مبنی ہے اور اگر کوئی علمی حقیقت جسے علمی حقیقت سمجھا جا رہا ہے کسی صحیح نظامِ حکمت کے ساتھ جو صحیح تصوّرِ حقیقت پر مبنی ہو مطابقت نہ رکھے تو اس کا مطلب ہوگا کہ وہ علمی حقیقت علم کے معروف اور مسلّم معیاروں پر پوری نہ اُتر سکے گی۔ غلط تصوّرات صحیح نظامِ حکمت کے اندر نہیں سما سکتے اور صحیح تصوّرات غلط نظامِ حکمت کے اندر داخل ہو کر اپنی اصلی حالت پر نہیں رہتے۔ لیکن صحیح نظامِ حکمت ہر دور میں تمام صحیح تصوّرات کو اپنے اندر جذب کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے اور یہی اس کی صحت کا قابلِ اعتماد معیار ہوتا ہے۔

ششم: وحدتِ کائنات کا مطلب یہ ہے کہ حقائق عالم ایک عقلی ترتیب اور تنظیم اختیار کر سکتے ہیں۔ حقائق عالم کی عقلی ترتیب اور تنظیم ہمارے معلوم اور نامعلوم حقائق کے درمیان ایک رابطہ یا کشش پیدا کرتی ہے اور ہمیں اس قابل بناتی ہے کہ ہم معلوم حقائق کی مدد سے نامعلوم حقائق

کو بہم دریافت کرتے چلے جائیں یہاں تک کہ حقائقِ عالم کے سلسلہ کی ساری کڑیاں اپنی اصلی عقلی ترتیب کے ساتھ ہمارے احاطۂ علم میں آجائیں۔ سائنسدان اور فلسفی دونوں اس کام کو انجام دینے میں لگے ہوئے ہیں اور ان کی کوششوں سے معلوم حقائق کی تعداد روز بروز بڑھتی جارہی ہے جوں جوں ان کی تعداد زیادہ ہوتی چلی جائے گی صحیح اور سچے تصورِ حقیقت کے ساتھ ان کے مجموعے کی علمی اور عقلی مناسبت بڑھتی چلی جائے گی اور ہر غلط تصورِ حقیقت کے ساتھ کم ہوتی جائے گی اور ہم اپنے وجدان کی شہادت کی بنا پر زیادہ آسانی کے ساتھ بتا سکیں گے کہ حقیقتِ کائنات کا کون سا ایسا تصوّر ہے جو ان حقائق کے ساتھ مناسبت رکھتا ہے اور کون سا ایسا ہے جو مناسبت نہیں رکھتا اور اس طرح سے ہم صحیح تصورِ حقیقت اور اس پر قائم ہونے والے صحیح نظامِ حکمت کے قریب آتے جائینگے

ہفتم: صحیح نظامِ حکمت جب وجود میں آئے گا تو ابتدا میں لازماً مختصر ہوگا اور پھر جوں جوں معلوم حقائق کی تعداد بڑھتی جائے گی اور وہ اس کے اندر سماتے جائیں گے تو وہ کامل سے کامل تر ہوتا جائے گا اور یہ سلسلہ تا قیامت جاری رہے گا۔ کیونکہ حقائقِ علمی کی کوئی حد نہیں نئے دریافت ہونے والے حقائقِ علمی کی تائید اور توثیق کی وجہ سے یہ نظامِ حکمت روز بروز مفصل اور منظم اور معقول ہوتا جائے گا اور اسی نسبت سے غلط نظام ہائے حکمت دن بدن اپنی معقولیت کھوتے جائیں گے حتیٰ کہ دنیا بھر میں یہ تسلیم کر لیا جائے گا کہ یہی نظامِ حکمت ہے جو ہر لحاظ سے درست اور تسلی بخش ہے اس نظامِ حکمت کے وجود میں آنے کے بعد ہر علمی ترقی خواہ وہ کسی شعبۂ علم سے تعلق رکھتی ہو یا تو اس کی تائید کرے گی یا پھر وہ کوئی علمی ترقی ثابت نہ ہوگی

وحدتِ کائنات کے اعتقاد کا سرچشمہ

وحدتِ کائنات پر انسان کے غیر شعوری وجدانی اعتقاد کا سرچشمہ دراصل اس کی فطرت کا یہ تقاضا ہے کہ وہ کائنات کا کوئی ایسا خالق مانے جو ایک ہی ہو اور انسان کی فطرت کا یہ تقاضا بے معنی نہیں۔ فطرتی تقاضوں کو پوری طرح سے مطمئن کرنے کا سامان قدرت کے اندر پہلے ہی موجود ہوتا ہے چونکہ کائنات سائنسدانوں اور فلسفیوں کی آج تک کی تحقیق سے ایک وحدت ثابت ہوئی ہے لہٰذا

اس کے اندر کوئی اصُول کارفرما ہے جو اس کو ایک وحدت بناتا ہے۔ قرآنِ حکیم کا ارشاد ہے کہ یہ اصُول خدا ہے جو کائنات کا خالق ہے جو ایک ہی ہے اور جس کا کوئی شریک نہیں۔ قرآنِ حکیم نے کائنات کی وحدت کی طرف پُرزور الفاظ میں توجہ دلائی ہے اور اس کو اس بات کے ثبوت کے طور پر پیش کیا ہے کہ کائنات کا خالق ایک ہی ہے۔

ما ترٰی فی خلق الرحمٰن من تفوٰت ط فارجع البصر ھل ترٰی من فطور ثم ارجع البصر کرتین ینقلب الیك البصر خاسئًا و ھو حسیر ہ

آپ خدا کی تخلیق میں کہیں کوئی ناہمواری نہ دیکھیں گے۔ ذرا نظر دوڑایئے (اور کائنات کا مشاہدہ کیجئے) کیا آپ کو خدا کی اس تخلیق میں کہیں کوئی بے لطفی نظر آتی ہے۔ پھر دوبارہ نظر دوڑایئے اور دیکھئے نگاہیں اس بات سے ناکام ہو کر آپ کی طرف لوٹیں گی کہ خدا کی تخلیق میں کہیں کوئی ناہمواری پا سکیں۔

قل ارایتم ماتدعون من دون اللہ ارونی ماذا خلقوا من الارض ام لھم شرك فی السمٰوٰت۔

اے پیغمبر (ان لوگوں سے) کہیے کیا تمہیں معلوم ہے کہ تم خدا کو چھوڑ کر کس سے حاجتیں طلب کرتے ہو۔ مجھے بتاؤ تو سہی کہ انہوں نے زمین میں کون سی چیز پیدا کی ہے۔ یا کیا آسمانوں کی تخلیق میں ہی ان کا کوئی حصّہ ہے؟

یعنی اگر کائنات کی تخلیق میں خدا کے ساتھ کوئی اور شریک ہوتا تو زمین و آسمان میں کہیں تو اس کی اپنی تخلیق کا نشان ملتا جہاں جُدا قسم کے قوانین قدرت نافذ ہوتے۔ ظاہر ہے کہ منکرین قرآنِ حکیم کے اس سوال کے جواب میں اسی کائنات کا ایک حصّہ پیش کر کے معقولیّت کے ساتھ نہیں کہہ سکتے تھے کہ صاحب! یہ ہے کائنات کا وہ حصّہ جو خدا کے اس شریک نے پیدا کیا ہے جسے ہم مانتے ہیں کیوں کہ جب کائنات کے اس حصّہ میں بھی قوانین قدرت وہی ہوں جو باقی کائنات میں ہیں تو کس طرح سے کہا جا سکتا ہے کہ اس کا خالق وہی نہیں جو باقی کائنات کا ہے۔

قرآنِ حکیم میں ایک اور مقام پر اس سے بھی زیادہ وضاحت کے ساتھ وحدتِ کائنات کی حقیقت کو وحدت خالق کی دلیل کے طور پر پیش کیا گیا ہے۔

لو کان فیھما الٰھۃ الا اللہ لفسدتا۔

اے پیغمبر (ان لوگوں سے) کہئے کہ اگر زمین میں خدا کے سوائے اور بھی خدا ہوتے تو دونوں (یعنی زمین اور آسمان) میں بدنظمی رونما ہو جاتی۔

یعنی چونکہ زمین اور آسمان میں کہیں بھی دو عملی بدنظمی یا تضاد موجود نہیں اور تم اس بدنظمی کا تصور بھی نہیں کر سکتے۔ بلکہ وحدتِ کائنات اور تسلسلِ قوانینِ قدرت کو خود بخود اپنے مسلّمات میں شمار کرتے ہو تو کیا یہ اس بات کی دلیل نہیں کہ کائنات کا خالق بھی ایک ہی ہے۔ چونکہ قوانینِ قدرت کے تسلسل کا مسلّمہ وحدتِ کائنات کی دلیل ہے اور وحدتِ کائنات وحدتِ خالق کی دلیل ہے اور چونکہ قرآنِ حکیم چاہتا ہے کہ انسان اپنے آپ کو قوانینِ قدرت کے مطابق بنائے لہٰذا انسان کو یقین دلانے کے لیے کہ یہ قوانین قابلِ اعتماد ہیں، قرآنِ حکیم بار بار ان کے تسلسل اور استقلال کی طرف توجہ دلاتا ہے۔

لن تجد لسنة الله تبديلاً

(اے پیغمبر) آپ خدا کے قوانین میں کہیں اور کبھی کوئی تبدیلی نہ پائیں گے۔

لن تجد لسنة الله تحويلاً

آپ خدا کے قوانین میں کہیں اور کبھی کوئی تغیّر نہ پائیں گے۔

دُوسرے فلسفیوں کی طرح اقبال بھی کائنات کو اس کی رنگا رنگی اور بوقلمونی کے باوجود ایک وحدت قرار دیتا ہے۔

زمانہ ایک حیات ایک کائنات بھی ایک
کمالِ بے بصری قصۂ قدیم و جدید

یہی وجہ ہے کہ اقبال کا فلسفہ دوسرے فلسفیوں کی طرح ایک نظامِ حکمت ہے لیکن اقبال میں اور دوسرے فلسفیوں میں فرق یہ ہے کہ اقبال کے نزدیک جیسا کہ قرآنِ حکیم کا ارشاد ہے کائنات کی وحدت کا اصُول یا حقیقتِ کائنات جو کائنات کی کثرت کو وحدت میں تبدیل کرتی ہے حق تعالیٰ کا وجُود ہے۔ ان صفات کے ساتھ جو خاتم الانبیاءؐ کی تعلیم میں اس کی طرف منسوب کی گئی ہیں اور دوسرے فلسفیوں میں سے ہر ایک حقیقتِ کائنات کا جو تصوّر قائم کیے ہوئے ہے وہ اس سے مختلف ہے۔ خدا کی فطرت وہ اصُول ہے جو پُوری کائنات کو متحد کرتا ہے۔ لہٰذا خدا کے عاشق کے دل میں پُوری کائنات سما جاتی ہے۔ انسانی انا ایک ہے لیکن اس کے خارجی اثرات بہت سے ہوتے ہیں وہ مخفی ہے لیکن اس کے

باقی صفحہ ۶۶ پر

حضرت مولینا مفتی محمد شفیع رحمۃ اللہ علیہ

اپنی تالیف وحدتِ اُمّت میں اگر

○ حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن رحؒ اور مولانا سید انور شاہ کاشمیری

کے درمیان فوز اور سبق آموز واقعات کے سوا اور کچھ نہ لکھتے

تب بھی یہ کتاب موتیوں میں تُلنے کی مستحق ہوتی

وقت کے اہم ترین موضوع پر اس بہترین اور مفید ترین کتاب کو

اب مکتبہ مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور نے شایانِ شان طور پر شائع کیا ہے

بڑے سائز کے ۵۲ صفحات ○ عمدہ دبیز کاغذ ○ دیدہ زیب کور

ہدیہ : ۴ روپے ○ علاوہ محصول ڈاک

ڈاکٹر اسرار احمد

نے اپنی دوسری دینی اور علمی خدمات کیساتھ ساتھ شادی بیاہ کی تقریبات کے ضمن میں

ایک اصلاحی تحریک

بھی برپا کی اور خطبۂ نکاح کو صرف ایک رسم

کی بجائے واقعی تذکیر و نصیحت اور معاشرتی زندگی سے متعلق اسلامی تعلیمات کو عام کرنے کا ذریعہ بنایا

اس موضوع پر ڈاکٹر صاحب کی ایک اہم تحریر اور ایک خطبۂ نکاح کو دیدہ زیب کتاب کی صورت میں شائع کر دیا گیا ہے۔

بڑے سائز کے ۴۸ صفحات ○ عمدہ دبیز کاغذ ○ دیدہ زیب کور۔

ہدیہ : ۳ روپے ——— محصول ڈاک علاوہ

ان دونوں کی زیادہ سے زیادہ اشاعت اہم قومی، ملی اور دینی فریضہ ہے

نقد و نظر

غلبۂ حال اور حضراتِ انبیاء کرام علیہم السلام

ستمبر ۸۶ء کے حکمت قرآن میں مولانا الطاف الرحمن صاحب بنوی نے اپنی زیر تالیف کتاب سیرت الخلیل کی ایک قسط میں حاشیے کے ایک نوٹ میں ایک تفسیری پیچیدگی کی وضاحت کرتے ہوئے اس معاملے پر بحث کی ہے کہ کیا کاملین پر بھی غلبۂ حال ہو جاتا ہے! اس پر دہلی سے ہمیں مولانا اخلاق حسین قاسمی صاحب کا درج ذیل مراسلہ موصول ہوا ہے جس میں انہوں نے اس معاملے میں اپنا نقطۂ نظر پیش فرمایا ہے۔

سیرتِ خلیل پر پاکستان کے فاضل جلیل مولانا الطاف الرحمن بنوی صاحب کا جو مضمون حکمت قرآن کے اگست و ستمبر ۱۹۸۶ء میں شائع ہوا ہے اسکے ایک حاشیہ (صفحہ ۶۶، ۶۷) میں کاملین امت کے لئے غلبۂ حال کی کیفیت کا تذکرہ کیا گیا ہے اور اس میں حضرات انبیاء کرام بلکہ موحد اعظم حضرت خلیل اللہ علیہ السلام اور سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی شامل کر لیا گیا ہے۔ کاملین اولیاء کی حد تک اس کیفیت کا انتساب درست ہے۔

غلبۂ حال میں بایزید بسطامی نے سبحانی ما اعظم شانی کہا۔ منصور نے انا الحق کا نعرہ لگایا۔ ان کے علاوہ صوفیاء کرام کی شطحیات کا ایک مستقل باب ہے، جن کے خلاف شریعت ہونے کی وجہ سے غلبۂ حال کی تاویل کی جاتی ہے ۔۔۔ یہاں تک کہ مولانا عبد الماجد صاحب دریا آبادی جیسے مستند اور کھلے ہوئے عالم نے مرزائے قادیانی علیہ اللعنۃ کے کفریہ دعووں کی تاویل کرنے کی تجویز پیش کرتے ہوئے یہ فرمایا تھا کہ انہیں غلبۂ حال پر محمول کیا جائے ۔۔۔ شاید بعد میں دریا آبادی صاحب نے رجوع کر لیا ہو۔

صوفی نذیر احمد صاحب کشمیری ایک پرانے اہل حدیث عالم ہیں جو الحمد للہ ابھی حیات ہیں اور جامعہ رحیمیہ دہلی میں قیام فرما ہیں۔ وہ مستقل طور پر اس نظریہ کے علمبردار ہیں اور امت میں صرف ایک خیالی اتحاد و اتفاق کے نام پر اس نظریہ کی وکالت کرتے رہے ہیں۔

غلبۂ حال ایک ذہنی کمزوری ہے جس میں مبتلا ہو کر انسان حق و حقیقت کے خلاف بعض کفریہ فقرے زبان پر لاتا ہے چونکہ جن حضرات کی مجموعی زندگی کتاب و سنت کے مطابق ہوتی ہے ان کی زبان پر ایسے فقروں کا آنا ان کی عام زندگی سے میل نہیں کھاتا اس لئے ان فقروں میں تاویل کر کے ان کی عام زندگی

کے احترام کو قائم رکھنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ لیکن حضرات انبیاء کا معاملہ بالکل جدا ہے۔ حفاظت الٰہی انہیں غلبۂ حال کی کمزوری سے محفوظ رکھتی ہے۔

فاضلِ جلیل نے حضرت ابراہیم کے بارے میں سورۂ توبہ (۱۱۴) کے تحت یہ بات صاف کردی کہ آپ نے اپنے باپ کے انجام کفر و انکار کے بعد ان کے حق میں دعاء مغفرت کرنے سے گریز کیا لیکن پھر ایک روایت بیان کرکے یہ ثابت کیا کہ حضرت ابراہیم نے قیامت کے دن اپنے اس باپ کے حق میں دعاء مغفرت فرمائیں گے۔ (کچھ دبی زبان سے باپ کی مغفرت اور نجات کے لیے عرضداشت پیش فرما ہی دیں گے)

روایت کے جس فقرہ سے بغوی صاحب کو یہ شبہ ہوا ہے وہ حسب ذیل ہے:۔

فای خذیٍ اخذی من الب الا بعلا	اے خدا آج اس سے بڑی میری کیا رسوائی ہوگی کہ میرا باپ تیری رحمتوں سے محروم ہے

اس فقرہ میں باپ کے لیے مغفرت کی دعاء و درخواست دبی زبان میں بھی نہیں ہے بلکہ اپنی رسوائی پر اظہار تعجب ہے اور اس سے بچنے کی درخواست ہے۔ چنانچہ خدا تعالیٰ نے اس کی تدبیر فرمائی اور آذر کو ایک خون آلودہ جانور کی شکل میں منتقل کرکے دوزخ میں ڈلوا دیا ۔۔۔ جس سے اس بات کی شہرت ختم ہوگئی کہ ابراہیم خلیل اللہ کا باپ جہنم میں ڈالا گیا ہے۔ بس یہی آپ کا منشا تھا ۔۔۔ اس واقعہ سے یہ خیال بھی نہ کیا جائے کہ خلیل اللہ نے اپنے آپ کو ذہنی اذیت سے محفوظ رکھنے کے لیے یہ سوال کیا، کیونکہ عالم آخرت عقائد و اعمال کا عالم ہے، خونی رشتوں اور نسبی علائق کا وہاں کوئی اثر باقی نہیں رہے گا، قرآن کریم نے کہا:

وتقطعت بهم الاسباب	ہر تعلق نسبی و ظاہری ٹوٹ جائے گا

(البقرہ: ۱۶۶)

قرآن و احادیث میں خون اور نسب کے رشتوں میں ایک دوسرے کی وجہ سے جو درجات کی بلندی اور سفارش کی قبولیت کا ذکر آتا ہے وہاں ایمان اور توحید کی شرط کے ساتھ ہے، قرآن نے کہا:

وَمَنْ صَلَحَ مِنْ آبَائِهِمْ وَأَزْوَاجِهِمْ وَذُرِّيَّاتِهِمْ (الرعد: ۲۳، الغافر ۸)	صلاحیت یعنی ایمان کی شرط لگائی گئی۔

توحید و ایمان کو بحفاظت لے جانے کے بعد اعمال خیر میں جو کمی اور نقص رہ جائے گا اسے

اللہ تعالیٰ اپنے نضل دکرم سے ماں باپ اور اہل اللہ کی دعاؤں کے ذریعے دور فرما دے گا۔

ایک جلیل المرتبہ پیغمبر آخرت میں باپ کی نسبی محبت سے مغلوب الحال اور بے قابو ہو جائے یہ تصور فاضل بنوی کے ذوق کی تسکین کا سامان کیسے بن گیا؟ —— جبکہ صریح نصوص میں اس کی کوئی گنجائش نہیں —— دنیا کی حد تک بے شک اسلام نے خون اور نسب کے فطری رشتوں کا پورا پورا لحاظ کیا ہے، کیونکہ اس زندگی کا تعلق فطرت سے ہے اور اسلام بھی دینِ فطرت ہے —— اور آخرت میں یہ فطرت بدل دی جائے گی۔ وہاں ایمان و عمل کی فطرت ہوگی —— جسم و جان کی فطرت نہیں ہوگی۔

دنیا کی فطرت کے بارے میں اکبر الہ آبادی مرحوم نے کہا ہے

کفر و اسلام کی تفریق نہیں فطرت میں
یہ وہ نکتہ ہے جسے میں بھی بمشکل سمجھا

لیکن آخرت کا نظام اس نظامِ فطرت سے بالکل مختلف ہوگا۔

فاذا نفخ بالصور فلا انساب بینھم یومئذ ولا یتسائلون

قیامت کا صور اس امر کا اعلان ہوگا کہ اب نسب و حسب کے رشتے ختم کئے جائیں گے اور ایمان و عمل کے رشتوں کی کارفرمائی قائم ہوگی۔

غلبۂ حال کے استدلال کے لئے فاضل محترم نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں عبداللہ ابن اُبی منافق کی نمازِ جنازہ اور دعاء مغفرت کی آیت کو بھی پیش کیا ہے اور یہ لکھا ہے کہ حضورؐ آیت توبہ (۱) استغفرلھم او لا تستغفرلھم ..... الخ کے قرآنی اسلوب کا یہ مدلول سمجھتے تھے کہ اس میں لفظ "او" کی تخییر برائے تخییر نہیں ہے اور نہ ستر کا عدد تحدید اور تعین کے لئے ہے پھر بھی آپ سے یہ منقول ہے "مجھے اختیار دیا، میں نے اختیار کیا اور میں ستر سے زیادہ دفعہ استغفار کر دوں گا۔"

اس سوال کا جواب مولانا محمد یعقوب کے حوالہ سے مولانا تھانوی نے یہ دیا ہے کہ آپؐ پر رحمت کا غلبہ تھا —— آگے فرماتے ہیں:

اس سے معلوم ہوا کہ غلبۂ حال کاملین پر بھی کبھی ہو جاتا ہے (بحوالہ اشرف الجواب)

حضورؐ نے اس آیت کی تخییر پر عمل نہیں کیا، کیونکہ دوسری آیات میں یہ صریح ہدایت موجود تھی کہ تبلیغ کو ہر حال میں کوئی قبول کرے یا قبول نہ کرے —— تبلیغ و دعوت کا فرض ادا کرنا چاہیے۔ حضرت عمرؓ نے آیت توبہ کا جو مطلب سمجھا وہی مطلب حضورؐ نے سمجھا لیکن آپؐ نے لفظی

گنجائش سے فائدہ اٹھا کر ایک دعوتی مصلحت پوری کر دی۔ حضرت عمرؓ کے جواب میں آپؐ نے فرمایا: "اے عمر! اگر مجھے معلوم ہوتا کہ میرا ستر سے زیادہ دفعہ دعا کرنا اس کے حق میں مفید ہوگا تو میں ضرور ایسا ہی کرتا۔" (بحوالہ قرطبی)

بہرحال حضرت عمرؓ کو یہ جواب دے کر آپؐ نے نمازِ جنازہ پڑھا دی اور پھر خدا تعالیٰ نے تصریح کے ساتھ منافقین کی نمازِ جنازہ پڑھنے سے روک دیا۔

وَلَا تُصَلِّ عَلٰٓى اَحَدٍ مِّنْهُمْ مَّاتَ اَبَدًا — ان منافقین میں سے آپ کسی پر آئندہ نمازِ جنازہ نہ پڑھیں (توبہ: ۸۴)

علماء اعلام نے حضورؐ کے اس فعل کو دعوتی اور دینی مصلحت سے وابستہ کیا ہے، رحمت و شفقت کا یہ بامقصد مظاہرہ تھا، اخلاقی مدارات کے طور پر آپ کا یہ فعل رونما ہوا ——— آپؐ کے دل میں حقیقی طور پر اس منافق کے لئے کوئی محبت و شفقت نہ تھی، اِلَّآ اَنْ تَتَّقُوْا مِنْهُمْ تُقٰىةً (آل عمران: ۲۸) کی تفسیر میں کفار کے ساتھ اخلاق و مدارات کی جو نوعیت بیان کی گئی ہے اس کا مطالعہ کیا جائے۔

مولانا تھانوی کی طرف سے مولانا محمد یعقوب صاحب کے حوالہ سے غلبۂ حال کی جو بات نقل کی گئی ہے ——— وہ صرف ایک صوفیانہ نکتہ ہے ——— کوئی تحقیقی بات نہیں ہے اور نہ مولانا تھانوی بیان القرآن میں اس کا حوالہ دے سکتے تھے۔

ابن ابی منافق کی نمازِ جنازہ کا معاملہ یہ تھا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے صاحبزادے عبداللہ کی درخواست پر ابن ابی کے جنازہ کی نماز پڑھائی اور اس کے کفن کے لئے اپنا کرتہ عطا فرمایا۔

یہ کرتہ عطا فرمانا احسان کا بدلہ تھا۔ ابن ابی نے حضرت عباس کو اپنا کرتہ دیا تھا جب وہ بدر کے قیدیوں کے ساتھ آئے تھے۔ عبداللہ ایک مخلص مسلمان تھے، انہوں نے آکر اپنے باپ کی وصیت نقل کی کہ آپؐ اس کے جنازہ کی نماز پڑھائیں، آپؐ نے از راہِ اخلاق قبول فرمالیا۔

حضرت عمرؓ نے سورۂ توبہ کی مذکورہ آیت کو یاد دلایا۔ آپؐ نے فرمایا اے عمر! مجھ کو استغفار سے منع نہیں کیا گیا آزاد رکھا گیا ہے کہ استغفار کروں یا نہ کروں۔ یہ فعل خدا کا ہے کہ ان کو معاف کرے نہ کرے۔ (سو اس منافق کے حق میں نہ سہی) ممکن ہے کہ دوسروں کے حق میں میرا یہ فعل مفید ہو اور نبیٔ رحمت کے اخلاقِ کریمانہ کو دیکھ کر لوگ اسلام کے قریب آجائیں۔

(تفسیر عثمانی شمائل صفحہ ۲۵۸)

اہلِ علم متقدمین ہوں یا متاخرین، اس بحث میں غلبۂ حال کی صوفیانہ اصطلاح کا کہیں نام تک لیتے نظر نہیں آتے۔

خدا تعالیٰ نے اپنی شانِ رحمت کی ہمہ گیری کا اظہار کرتے ہوئے فرمایا:

ان رحمتی سبقت علی غضبی — میری رحمت میرے غصّہ و غضب سے سبقت لے جاتی ہے

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم خدا تعالیٰ کی اسی شانِ کریمی کا مظہرِ کامل تھے، ابن ابی کے معاملہ میں آپ کی اس شانِ لطف و کرم کا مکمل ظہور ہوا اور وہ ظہورِ عفو و کرم دینِ حق کے لیے مفید ثابت ہوا۔

مفتی محمد شفیع صاحب فرماتے ہیں کہ آپ نے وحی الٰہی کے ظاہری الفاظ کی تخییر پر نظر رکھی، عربی محاورہ کے مطابق آیت کے مفہوم مرادی سے صرف نظر کیا کیونکہ ممانعت کی صریح ہدایت موجود نہیں تھی — اور اس کا سبب ایک دعوتی مصلحت تھی کہ دوسرے لوگ آپ کے اخلاقِ کریمانہ کو دیکھ کر اسلام کے قریب آجائیں چنانچہ قبیلہ خزرج کے ایک ہزار افراد نے اس واقعہ کے بعد اسلام قبول کیا — ایک روایت کے مطابق۔

مفتی صاحب نے آیت تخییر کی مثال میں سَوَاءٌ عَلَيْهِمْ أَأَنذَرْتَهُمْ أَمْ لَمْ تُنذِرْهُمْ (البقرہ ۶) پیش کی ہے۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام عالم آخرت میں حضرت حق تعالےٰ کے سوال کا جواب دیتے ہوئے اپنی گمراہ امت (نصاریٰ) کے بارے میں عرض کریں گے

إِن تُعَذِّبْهُمْ فَإِنَّهُمْ عِبَادُكَ وَإِن تَغْفِرْ لَهُمْ فَإِنَّكَ أَنتَ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ (المائدہ) ۱۱۸ — اے خدا! اگر تو انہیں عذاب دے تو وہ تیرے بندے ہیں اور اگر تو ان کو معاف کر دے تو تو ہی بے زبردست حکمت والا۔

حضرت عیسیٰ عذاب اور مغفرت دونوں باتوں کا خُدائی اختیار ظاہر کر کے خداوندِ عالم کی قدرتِ کاملہ اور حکمتِ بالغہ کا اعتراف کریں گے، یہ جانتے ہوئے کہ کفر و انکار اور شرک و بغاوت کے ساتھ آخرت میں خدا کی رحمت جمع نہیں ہو سکتی، اسی لئے حضرت عیسیٰ خدا تعالےٰ کی صفتِ غفور رحیم کا ذکر نہیں فرمائیں گے جیسا کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے دنیا میں گمراہوں سے

کے بارے میں فرمایا تھا :

فَمَنْ تَبِعَنِیْ فَاِنَّہٗ مِنِّیْ وَمَنْ عَصَانِیْ فَاِنَّکَ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ (ابراہیم ۳۶)

خداوندا! جو میری پیروی کرے وہ میرا ہے اور جو میری نافرمانی کرے تو تو بلاشبہ غفور رحیم ہے۔ (اور تیری یہ صفت رحمت انہیں توبہ اور رجوع کی توفیق دے کر اپنے دامن میں چھپا سکتی ہے)

اس اسلوب میں گمراہوں کے حق میں مغفرت بمعنی توبہ و ہدایت کی طلب پوشیدہ ہے۔
اسی مفہوم میں حضرت ابراہیم نے اپنے مشرک باپ کے لیے استغفار کی دعا کا وعدہ کیا تھا،

سَاَسْتَغْفِرُ لَکَ رَبِّیْ اِنَّہٗ کَانَ بِیْ حَفِیًّا (مریم ۴۷)

میں ضرور آپ کے لیے مغفرت طلب کروں گا۔ بلاشبہ میرا رب مجھ پر بڑا مہربان ہے وہ اسے ضرور قبول کرے گا۔

لیکن حضرت ابراہیم کی یہ توقع پوری نہیں ہوئی اور آپ کا باپ شرک اور بت پرستی سے توبہ کرنے کے لیے تیار نہ ہوا۔

کسی جذبہ کے ساتھ بھی کسی مشرک کے لیے مغفرت و نجات کی دعا ایک پیغمبر کے لیے جائز نہیں ہو سکتی، جب تک وہ مشرک رہے۔

آخر جمہور علماء کے مسلک کے مطابق رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی دل سوزی کے ساتھ اپنے محسن چچا کے حق میں دعوت و تبلیغ کی جدوجہد کامیاب کیوں نہ ہوئی؟ —— یہ خداوند حکیم کی حکمت بالغہ ہے۔ —o—

دین کے انتہائی اہم اور بنیادی موضوع
حقیقت و اقسام شرک پر ڈاکٹر اسرار احمد
کے ایک ایک گھنٹے کے چھ لیکچرز جو C-60 کے چھ کیسٹوں میں دستیاب ہیں
ہدیہ پاکستانی کیسٹ -/100 روپے (جاپانی کیسٹ) -/190 روپے مع محصول ڈاک
تین سو سے زائد عنوانات پر مشتمل فہرست طبع شدہ موجود ہے خط لکھ کر طلب فرمائیں
نشر القرآن کیسٹ سیریز
۳۶ - کے ماڈل ٹاؤن لاہور

قرآن مجید اور عدد ۱۹

مولانا عبدالقدوس ہاشمی ندوی

دس بارہ سال سے یہ بات چل رہی ہے کہ عدد ۱۹ کا ایک خاص تعلق قرآن مجید سے ہے بلکہ اس سے بڑھ کر یہ بھی دعویٰ کیا جارہا ہے کہ قرآن مجید کی ایک ریاضیاتی بنیاد ہے - اور وہ بنیاد ۱۹ کا عدد ہے - لوگ عام طور پر عجائب پسند ہوتے ہیں، عوام تو عوام اچھے خاصے پڑھے لکھے اور دیندار لوگ بھی اپنی دانست میں مخلصانہ دینی خدمت سمجھ کر مختلف زبانوں میں کتابچے اور مقالات اس کے ثبوت میں لکھ رہے ہیں اور بڑے پیمانہ پر شائع کر رہے ہیں اور بیانات دے رہے ہیں - کہ عجائبات قرآنی میں یہ بھی ایک عجوبہ ہے - معجزہ ہے اور قرآن مجید کے منزل من اللہ ہونے کی ایک دلیل محکم ہے -

میرے پاس امریکہ سے اور جنوبی افریقہ سے کئی بار متعدد اشتہار، کتابچے اور درقیے بھیجے گئے اور اس کے متعلق سوالات کئے گئے - میں نے ان خطوط کے جوابات دیئے - لوگوں نے میرے جوابات اردو - انگریزی اور عربی میں بار بار شائع کئے مگر اب بھی میرے پاس اس سلسلہ میں استفسارات آرہے ہیں، شاید یہ لوگ اور کسی قدر تفصیل کے ساتھ قرآن مجید کی ریاضیاتی بنیاد اور عدد ۱۹ کے متعلق معلوم کرنا چاہتے ہیں - اس لئے میں اُن ہی جوابات کو کسی قدر تفصیل کے ساتھ پیش کر رہا ہوں - اور دعا کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ ہمیں وہم سے نجات دے - اور یقین کی طرف رہنمائی فرمائے -

جو لوگ امریکہ سے عدد ۱۹ کا قرآن مجید سے بنیادی تعلق ہونے کی مہم چلا رہے ہیں، ان کا تعارف انشاء اللہ تعالیٰ اس مضمون کے آخر میں پیش کر دیا جائیگا - پہلے یہ دیکھئے کہ وہ کیا کہتے ہیں اور کس بنیاد پر کہتے ہیں جو لوگ یہ "معجزۂ قرآن" بنا کر پیش کر رہے ہیں وہ کہتے ہیں کہ :-

۱ - قرآن مجید کا ایک عددی نظام ہے اور یہ نظام عدد ۱۹ پر قائم ہے، یہ نظام ایک معجزۂ قرآنی ہے۔

۲ - امریکہ میں کمپیوٹر کے ذریعہ یہ معجزہ ظاہر ہوا ہے۔ اس سے پہلے کسی کو معلوم نہ تھا۔ خود نبی علیہ السلام کو، ان کے صحابہ کرام کو یا زمانہ مابعد کے علماء مفسرین، محدثین اور فقہاء کو اس معجزۂ قرآنی کی اطلاع نہ تھی۔

۳ - یہ معجزہ اس طرح ثابت ہوتا ہے کہ بسم اللہ الرحمٰن الرحیم میں ۱۹ حروف ہیں اور سورۃ المدثر کی آیت ۳۰ میں اللہ تعالیٰ نے جہنم پر متعین فرشتوں کی تعداد ۱۹ بتائی ہے۔ اس کے بعد مختلف سورتوں میں سے مختلف حروف مثلاً سورۃ الاعراف میں سے حرف ص کی تعداد لیجئے تو وہ ۱۹ پر تقسیم ہو جاتی ہے۔ یا سورۃ ق میں سے حرف ق کی تعداد کو لیجئے تو وہ بھی ۱۹ پر تقسیم ہو جاتی ہے۔ اسی طرح مختلف سورتوں سے مختلف حروف لے کر اور ان میں جمع، ضرب اور تقسیم کر کے یہ بات ثابت کی گئی ہے کہ عدد ۱۹ قرآن مجید کا بنیادی عدد ہے اور اسی پر قرآن مجید کا معجزانہ ریاضیاتی نظام قائم ہے۔

مندرجہ بالا تینوں اقوال کو واقعات اور حقیقتوں کے مقابلہ میں رکھنے سے پہلے اس لاعلمی اور جہالت کی داد دیجئے کہ جب ساری دنیا کو یہ معلوم ہے اور حقیقت واقعی بھی یہی ہے کہ قرآن مجید تحریری شکل میں لکھا ہوا نازل نہیں ہوا تھا۔ اور خود قرآن مجید بھی یہی کہتا ہے۔

قرآن مجید ۶۱۰ء سے ۶۳۲ء تک بائیس سال اور کچھ ماہ و دن تک تھوڑا تھوڑا کر کے نازل ہوتا رہا۔ کبھی ایک آیت بھی لکھی ہوئی نازل نہیں ہوئی بلکہ جب کوئی آیت نازل ہوتی تھی تو آپ اس کی زبانی تعلیم اپنے صحابہ و صحابیات کو دیتے تھے اور اس وقت جو حروف مکہ و مدینہ میں رائج تھے ان حروف میں آپ اس آیت کو لکھوا لیتے تھے۔ دوسرے صحابہ کرام بھی جہاں یاد کر لیتے تھے۔ وہاں لکھ بھی لیا کرتے تھے، چونکہ ان کے پاس کاغذ بہ آسانی دستیاب نہ تھا۔ اس لئے یہ لوگ کاغذ کے علاوہ چمڑے پر چوڑی ہڈی اور کھجور کے جریدوں پر اور دوسری ایسی ہی چیزوں پر بھی لکھ لیتے تھے۔ اس کے لئے وہ جو حروف استعمال کرتے تھے وہ کوفی

بدید حروف نہ تھے۔ بلکہ وہی مروج عربی حروف تھے جن میں ان کے عہدنامے اور جاہلی شعراء کے قصائد لکھے جاتے تھے۔ ان ہی حروف میں قریش کے تجار اپنے تجارتی حساب و کتاب بھی لکھتے تھے۔

اس بات کو ذہن میں رکھ کر غور کیجئے کہ کتنا بڑا مغالطہ یا پھر کیسی قابل داد جہالت ہے کہ کسی سورہ میں کسی خاص حرف مثلاً حرف ص یا ق یا کسی اور حرف کو گن کر اس کی تعداد کو قرآن مجید کا ریاضیاتی نظام بنا یا جائے۔ حروف اور رسم الخط تو الہامی اور منزل من اللہ نہیں ہیں۔ اس کی تعداد کو عجوبہ یا معجزہ کیسے قرار دیا جا سکتا ہے اور آج جو قرآن مجید قلمی یا مطبوعہ ملتا ہے وہ تو عربی رسم الخط کی اس ترقی یافتہ صورت میں ملتا ہے۔ جو ابن مقلہ وزیر دربار خلافت بغداد نے عربی رسم الخط کو مختلف انداز میں لکھ کر بنائی تھیں۔ ابن مقلۃ الوزیر کی وفات ۳۲۸ھ ہجری میں بغداد میں ہوئی تھی۔ اس کے کارنامہ کو مابعد کے ایک فارسی شاعر نے اس طرح ادا کیا ہے۔ ؎

ابن مقلہ وضع کردہ شش خط از خط عرب   نسخ و توشیخ و موقع، ثلث تعلیق و رقاع

یعنی عربوں میں زمانہ یادگار سے جو طریقہ تحریر رائج تھا اور جس کی بہت سی صورتیں ابن مقلۃ الوزیر کے زمانہ تک پیدا ہو چکی تھیں، ان کو سامنے رکھ کر ابن مقلۃ الوزیر نے چھ قسم کے خط پیدا کئے۔ لیکن یہ سب اسی قدیم عربی رسم الخط کو لکھنے کی مختلف شکلیں ہیں۔ حضرت معاویہؓ امیرالمومنین نے بھی ایک جدید طرز کتابت پیدا کر لیا تھا جسے خط دیوانی کہا جاتا ہے۔ کوفہ کے کاتبوں نے اقلیدس کے خطوط پر منطبق کر کے ایک طرز کتابت پیدا کر لیا تھا جسے کوفی خط کہتے ہیں۔ ابن مقلہ کے بعد عربی حروف کے لکھنے میں ترقیاں ہوتی رہیں۔ مثلاً نسخ اور تعلیق کو ملا کر خط نستعلیق بنا۔ خط ثلث سے خط طغرا، بنا وغیرہ وغیرہ۔

اس زمانہ میں جو قلمی یا مطبوعہ مصاحف قرآنی ہمیں ملتے ہیں وہ زیادہ تر خط نسخ یا خط ثلث میں ہوتے ہیں۔ یہ اسی طرح انسانی مساعی کا نتیجہ اور انسان کی صنعت گری کے ثمرات ہیں۔ جیسے دنیا میں سینکڑوں دیگر صنعتوں کے نتائج دکھائی دیتے ہیں اس میں حروف کی تعداد یا نقطوں اور اعراب کی تعداد

سے قرآن کے لئے کوئی ریاضیاتی نظام پیدا کرنا ایسی ہی جاہلانہ کوشش ہے جیسے کوئی کھنکھجوروں کے چالیس پیروں سے حضرت سلیمان علیہ السلام کی تخت نشینی کا سال ثابت کرے۔

دوسری بات اس سلسلہ میں غور طلب یہ ہے کہ جب قرآن مجید نے سارے کفار عرب کو یہ چیلنج دیا تھا کہ اگر قرآن مجید کے مُنزّل من اللہ ہونے میں تمہیں شک ہے تو ایسی دس سُورہ یا ایک ہی سورہ بنا لاؤ، تو کیا یہ چیلنج تھا کہ ایک ایسی سورہ بنا لاؤ جس میں صرف ص یا حرف ق اتنی تعداد میں استعمال ہو کہ وہ عدد ۱۹ پر پورا تقسیم ہو جائے۔ اگر تحدی اسی قدر تھی تو یہ کیا مشکل کام تھا۔ متعدد قصائد بے نقط الفاظ کے آج بھی موجود ہیں اور ایک قصیدہ یا دس سورہ تو بہت طویل کام نہیں پورے قرآن مجید کی ضخیم تفسیریں بے نقط فیضی کی سواطع الالہام اور مولانا عبداللہ الترک کی درالاسرار تو بار بار چھپ چکی ہیں۔ اگر ایسی تفسیر لکھی جا سکتی ہے اور پورے قرآن مجید کی ضخیم تفسیر لکھی جا سکتی ہے۔ جس میں کہیں نقطہ والا کوئی حرف ہی نہ آئے۔ تو کیا یہ مشکل بات ہے کہ ایک سورہ ایسی بنا لی جائے جس میں ۱۹ بار، ۳۸ بار یا ۵۷ بار ص، ق یا کوئی خاص حرف آئے۔ اس قسم کی شرطوں کے ساتھ عربی میں اور دوسری زبانوں میں بھی بہت سی منظوم و منثور تحریریں موجود ہیں۔ انہیں لزوم مالا یلزم یا لزومیات کہتے ہیں۔

قرآن مجید اپنی تحریر و املاء، یا حروف تہجی کی مخصوص تعداد کی وجہ سے معجزہ نہیں ہے بلکہ فصاحت و بلاغت اور مسائل حیات پر ہمہ گیر ہدایات کی وجہ سے معجزہ ہے اور ایسا معجزہ ہے کہ آج تک اس کے مقابلہ کی کوئی تحریر پیش کرنے پر انسان قادر نہ ہو سکا۔ حالانکہ بہتوں نے مختلف زبانوں میں اس کی کوشش کی۔ عبداللہ بن المقفع نے کوشش کی۔ علی محمد باب نے کوشش کی۔ بہاء اللہ حسین نوری نے کوشش کی۔ اور بہت سے منچلوں نے کوئی دقیقہ اٹھا نہ رکھی مگر کسی کو کچھ حاصل نہ ہوا۔

تیسری بات جو ۱۹ کے چکر کو دیکھ کر سامنے آتی ہے وہ یہ ہے کہ اگر یہ دعویٰ بفرض محال صحیح بھی ہو کہ قرآن مجید میں سے بعض حروف کی تعداد بعض سورتوں میں ایسی ہے جو (۱۹) پر برابر تقسیم ہو جاتی ہے تو یہ بات قرآن مجید کے آسمانی کتاب ہونے

کی دلیل کیسے ہو سکتی ہے۔ دعوے اور دلیل کے مابین منطقی ربط کیا ہے؟ اگر کوئی عقلمند یہ کہے کہ زمین کی شکل کروی ہے اور اس کی دلیل یہ پیش کرے کہ چاول سفید ہوتا ہے۔ یا کوئی علامۃ الدھر یہ کہے کہ لیموں چونکہ درختوں میں پھلتا ہے اس لئے مچھلیاں پانی میں ہوتی ہیں تو ایسی دلیلوں کے جواب میں کوئی کیا کہہ سکتا ہے؟

چوتھا سوال جو ذہن میں پیدا ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ قرآن مجید میں بہت سے اعداد کا ذکر آیا ہے۔ اور سورۃ الحاقہ کی آیت میں حاملان عرش کی تعداد آٹھ بتائی گئی ہے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے لئے بارہ نہریں جاری ہو گئی تھیں اس کا ذکر بھی قرآن مجید میں ایک سے زیادہ آیتوں میں موجود ہے۔ اسی طرح قرآن مجید میں سو، ہزار، ستر اور دیگر اعداد کا بھی ذکر موجود ہے۔ ان سارے اعداد کو چھوڑ کر صرف عدد ۱۹ ہی کو ساری اہمیت کیوں دی جا رہی ہے۔ کیا اس عدد سے کسی گروہ کے افکار و عقائد وابستہ ہیں۔ ج

انشاء اللہ عنقریب معلوم ہو جائے گا کہ عدد ۱۹ سے کس کے عقائد وابستہ ہیں۔ اور کس طرح چالاکی کے ساتھ یہ مہم اس وقت چلائی جا رہی ہے اور یہ بھی واضح ہو جائے گا کہ کافرانہ افکار و عقائد اور قدیم دیومالاؤں میں اوّلین عدد ایک اور سب سے بڑی اکائی نو کے اس مرکب (۱۹) سے کتنے اوہام وابستہ ہیں۔

اعداد یہ جو اعداد آج ساری دنیا میں رائج ہیں، ان کی ابتدا اس طرح ہوئی تھی کہ انسانوں کو اپنے دونوں ہاتھوں کی انگلیوں کی تعداد دس نظر آئی اس پر غور کرنے کے بعد انہوں نے یہ طریقہ اختیار کر لیا کہ دائیں سے بائیں کی طرف اعداد کو دس گنا کرنا شروع کر دیا۔ چونکہ عام طور پر انسان اپنے دائیں ہاتھ سے کام کرتا ہے اور اس کے دائیں ہاتھ کا موڑ دائیں سے بائیں کی طرف ہے اس لئے یہی ہوتا تھا کہ اعداد دائیں سے بائیں کی طرف انگلیوں کی تعداد کے مطابق بڑھتے رہیں۔ اسی وجہ سے ہم دیکھتے ہیں کہ خط سامی ہو یا آریائی سب میں اوّل اکائی اور اس کے بائیں دہائی ہوئی ہے۔ (۱-۱۰-۱۰۰-۱۰۰۰)

صرف ایک استثناء اس میں اس وقت نظر آتا ہے جب کہ بعض قدیم اقوام میں سکہ اور رقم کے لئے ہاتھوں اور پیروں کی ساری انگلیوں کو ملا کر عدد (۲۰) کی

ایک وحدت قائم کی گئی۔ مثلاً ہندوستان میں بیس کوڑی برابر ہے ایک روپیہ کے اور بیس دام کو ایک آنہ قرار دیا گیا تھا۔ اسی طرح انگلستان میں ایک پاؤنڈ کی بیس شلنگ قرار دی گئی۔ اور بھی چند قدیم قوموں میں بیس کی وحدت عملاً حساب میں رائج رہی۔ لیکن اعداد کی قیموں میں اضافہ کا ایک ہی طریقہ رائج رہا۔ وہ ایک دس، سو، ہزار کا دائیں سے بائیں کی طرف بڑھنے کا طریقہ تھا جو اب تک ساری دُنیا میں رائج ہے۔

ابتداء میں ان اعداد میں سے کسی سے کوئی اثر وابستہ نہیں کیا گیا تھا کسی عدد کو نہ متبرک سمجھا جاتا تھا اور نہ کسی کو منحوس قرار دیا جاتا تھا۔ اسی طرح ہفتہ کے سات دنوں میں سے کوئی دن منحوس نہیں سمجھا جاتا تھا۔ حالانکہ دن کے نام ابتدائی بابلی تمدن میں آفتاب، ماہتاب اور اس وقت تک معلوم شدہ خمسہ متحیرہ (پانچ ستاروں) ہی کے نام پر رکھے گئے تھے۔ یہی نام اب بھی رائج ہیں۔ آج بھی انہیں سن ڈے سون کا دن من ڈے چاند کا دن کہا جاتا ہے۔ ہندوؤں میں بھی اتوار، سوموار وغیرہ کے یہی معنی ہیں۔ لیکن ابتداءً بدھ وار یعنی ستارہ زہرہ یا عطارد کے دن کو منحوس نہیں سمجھا جاتا تھا۔

پھر جیسے جیسے لوگوں میں بت پرستی پھیلتی رہی، طرح طرح کے اوہام پیدا ہوتے رہے۔ پہلے خالق و مخلوق کے مابین محبت کو ماں اور اولاد کے مابین محبت سے تعبیر کیا گیا اور دیویاں پیدا ہوئیں۔ اور اس کثرت سے ہر ہر بات کے لئے دیویاں وجود میں آئیں کہ یونان اور ہندوستان کی دیومالاؤں میں دیویاں ہی دیویاں نظر آتی ہیں۔ پھر اس کا ردعمل ہوا اور خالق و مخلوق کے مابین رشتۂ محبت کو باپ اور بیٹے کے مابین محبت سے تعبیر کیا جانے لگا۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ بہت سے خدا کے بیٹے اور فرزند قرار پائے۔ مصری دیوتا ہوسیروس، ایرانی دیوتا متر اور نبی برحق حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے ابن اللہ ہونے کے عقاید اسی ردعمل کے نتائج ہیں۔ اس کے بعد عورتیں خدا کی دولہنیں بن گئیں۔ دیوداسیوں اور ننوں کو دیکھ لیجئے۔ مردوں نے اس کے جواب میں خدا کی دولہنیں بن کر سداسہاگ کے گروہ پیدا کر لیے۔

اس طرح جب اولاد آدمؑ میں کافرانہ توہمات پھیلے اور انبیاء علیہم السلام

کی تعلیمات سے روگردانی کر کے لوگوں نے سینکڑوں قسم کی وہمی باتیں پیدا کر لیں تو مختلف اقوام میں مختلف قسم کی دیو مالائیں بن کر تیار ہو گئیں۔ ان دیو مالاؤں میں جہاں اجسام ارضی اور اجرام سماوی میں تصرفات کی قوتیں تسلیم کر لی گئیں۔ مختلف اعداد کے بھی اثرات، ان کے تقدس اور نحوست کے وہمی افکار کا اثر پیدا ہوا۔ علم الاصنام (میتھالوجی) کے مطالعہ سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ خیال بابلی، اشوری، مصری ایرانی اور ہندوستانی دیو مالاؤں میں بہت ہی قدیم زمانہ سے موجود تھے اور آج تک کسی نہ کسی صورت میں موجود ہیں۔ موجودہ زمانہ میں علم الاعداد پر بہت سی کتابیں اور مقالات لکھے جاتے ہیں۔ انہیں کے عدد میں گنتی کا پہلا عدد ایک اور سب سے بڑی اکائی نو شامل ہے۔ اس کے اثرات اور تصرفات انسانوں پر اور زمینی حوادث پر بڑے بڑے مبالغوں کے ساتھ بیان کئے جاتے ہیں۔ انہیں ہی نہیں بلکہ دوسرے اعداد کو مختلف لوگوں نے بڑا تقدس عطا کیا۔ یہودی عدد (۷) اور (۱۲) کو مقدس کہتے ہیں۔ عیسائی عدد (۱۳) کو منحوس سمجھتے ہیں۔ ہندو عدد (۳) کو منحوس بتاتے ہیں۔ عدد (۸) کو باعث شر بتاتے ہیں اور نو اور خود مسلمانوں میں علم الاعداد پر کتابیں لکھی گئیں۔ اعداد متبرکہ، اعداد منحوسہ، اعداد متحابہ، اعداد متباغضہ کی تشریحات پر عربی میں بہت سے مقالات اور کتابیں ملتی ہیں۔ لوگ طبعاً عجائب پسند ہوتے ہیں۔ ہر عجیب بات کو بڑی آسانی کے ساتھ قبول کر لیتے ہیں اور پھر یہ بات خوب پھیلتی ہے۔ حالانکہ یہ باتیں ایسی ہوتی ہیں کہ ان کے لئے کوئی عقلی دلیل نہیں ہوتی۔ اور نہ اللہ نے ایسا کوئی علم نازل فرمایا ہوتا ہے۔ مثلاً قمر در عقرب، پنچک، چہار شنبہ کی نحوست، سنیچر کی اثرات اور کتنے ہی ایسے توہمات ہیں جن کی کوئی علمی و عقلی بنیاد نہیں اور نہ کسی نبی برحق نے ان سے متعلق کوئی خبر دی ہے لیکن دیکھئے تو کس قدر عمومیت کے ساتھ یہ عام انسانوں میں ہی نہیں بلکہ مدعیان توحید کے دماغوں میں بھی جا گزیں ہیں اور شاعروں نے ان توہمات کو اپنی شاعری کے ذریعہ انسانی دماغوں میں ایسا بٹھایا ہے کہ یہ وہم نہیں بلکہ حقیقت مسلمہ بن گئے ہیں۔ حافظ شیرازی کا شعر ہے۔ ؎

این چہ شوریست کہ در دور قمر می بینم
ہمہ آفاق پر از فتنہ و شر می بینم

یہ ایک پوری غزل ہے جس میں طرح طرح سے حافظؔ نے قمر جب سال کا بادشاہ ہو تو اس کے اثرات کو بیان کیا ہے۔ ان اثرات کے سلسلہ میں بتایا گیا ہے کہ ؎

دختراں را ہمہ جنگ است وجدل با مادر
پسراں راہ بدخواہ پدر می بینم

بھلا یہ کسی ذی ہوش کی سمجھ میں آسکتا ہے کہ ایک سال کے یا بارہ سال کے لئے چاند بادشاہ ہو کر عالم پر متصرف ہو جاتا ہے۔ اور اس کے اثرات یہ ہوتے ہیں کہ ساری دنیا پر فتنہ و شر کا غلبہ ہو جاتا ہے۔؟

فارسی شاعری سے اردو کا ڈانڈا ملتا ہے اُردو ہندی کے شاعروں نے بھی اوہام کو نظم کرتے میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی، ان دو شعروں ہی کو دیکھئے۔ شاعر کا خود عقیدہ کیا تھا۔ معلوم نہیں اس قسم کے شعروں نے بھی اوہام کو پھیلانے میں خاصا کام کیا۔

(۱)
ڈوبتے جاتے ہیں گنگا میں بنارس والے
نوجوان کا سنیچر ہے یہ بوڑھوا منگل

(۲)
بدھوار سُدی تیرج راہ کٹھن پردیس جا
کیا لوے برہمن سُبھ سمے جب سُبھ ہوئے کوئی دنا

حیرت انگیز بات تو یہ ہے کہ ایشیا اور افریقہ کے جاہلوں سے کم اس کا چرچا یورپ اور امریکہ کے دہمیوں میں موجود نہیں ہے۔ انگریزی میں درجنوں کتابیں اعداد اور ان کے اثرات پر ملتی ہیں۔ جن میں مسٹر چیرو کی کتاب الاعداد کی بڑی شہرت ہے۔ ان کتابوں میں ہر انسان کا ایک عدد بتایا جاتا ہے۔ اور پھر اس عدد کے ماتحت اس کی زندگی کی تشریح کی جاتی ہے۔

اسلام میں اس قسم کے دیو مالائی اوہام کے لئے کوئی گنجائش نہیں۔ اعداد کے اثرات یا تنجیم کے تصرفات کو کبھی قبولیت حاصل نہ ہو سکی۔ اہل علم ہر زمانہ میں ان اوہام کی شدت کے ساتھ تردید کرتے ہیں۔ لیکن مختلف قدیم اقوام سے متاثر ہو کر ابتدائی دو تین صدیوں کے بعد کچھ نہ کچھ جاہل عوام میں یہ اوہام پیدا ہو گئے اور پیشہ ور مرشدوں کے لئے کمائی کا ایک ذریعہ پیدا ہو گیا۔ یہاں تک کہ قرآنی آیات کے ابجدی

اعداد نکال کر تعویذ لکھے جانے لگے، اور آج تک بعض لوگ بسم اللہ کی بجائے (۷۸۶) لکھ کر سمجھتے ہیں کہ بسم اللہ لکھ دیا۔ کہیں کہیں جاہلوں نے بجائے محمدؐ عدد (۹۳) لکھا بعض نے علی کی بجائے (۱۱۰) لکھا۔ کسی نے ایک قدم اور بڑھایا "یا علی" لکھایا اس کے اعداد جمل (۱۲۱) سرنامہ پر لکھ دیا۔

میرے مطالعہ میں ایسی کوئی روایت تاریخی نہیں آئی جس سے یہ معلوم ہو سکے کہ ابتدائی دو صدیوں میں کسی مسلمان نے اعداد کے ساتھ کوئی اہمیت یا تقدس وابستہ کیا تھا۔ عہد صحابہ اور عہد تابعین کے بعد پہلی مرتبہ ایک کاذب مدعی نبوت بابک خرمی نے ایرانی جاہلوں میں عدد ۹ کی اہمیت کا خیال پیدا کیا بابک خرمی کو کئی خونریز جنگوں کے بعد ۲۲۲ھ ہجری میں قتل کر دیا گیا۔ اس کے بعد پھر کسی نے شاید اس طرح کا واہمہ نہیں پیدا کیا۔ واللہ اعلم بالصواب۔

اب جو عدد ۹ کے ریاضیاتی بنیاد بنانے کا چرچا کیا جا رہا ہے۔ وہ بہائیوں کے عقائد واوہام نے انیسویں صدی عیسوی (تیرہویں صدی ہجری) میں پیدا کیا ہے اور اس کی تشہیر بہائیوں کی تبلیغی مہم کا حصہ ہے۔ امریکہ میں بہت سے بہائی رہتے ہیں۔ انہوں نے اس مقصد کے لئے ایک مصری قبطی ریچرڈ کی خدمات حاصل کی ہیں جس نے اپنا نام رشاد رکھ لیا ہے۔ اس سے بہائی اس سلسلہ میں کام لے رہے ہیں۔

بہائیوں کی عدد ۹ سے وابستگی ایسی ہے کہ ہر بہائی ہال پر ہر جگہ جلی قلم سے ۹ کا عدد لکھا ہوتا ہے۔ ان کا مذہبی کلنڈر ۱۹ مہینوں کا ہوتا ہے۔ ہر مہینہ کے دن ۱۹ ہوتے ہیں۔ اسطرح وہ شمسی سال کے ۳۶۵ دنوں کو ۱۹×۱۹=۳۶۱ پر تقسیم کر کے اور اس پر چار دنوں کو سال کے ایام مسترقہ قرار دے کر ۳۶۵ کا عدد پورا کر لیتے ہیں یہ لوگ بہائی ہال کے نام سے ہر جگہ اپنا تبلیغی مرکز بناتے ہیں۔ اور وہاں سے رسائل اور کتابچے شائع کر کے اپنے عقائد اور اپنے مذہب کا پرچار کرتے ہیں۔ بڑے خفیہ انداز میں لیکن بڑی گرمجوشی سے وہ اپنے عقائد کی تبلیغ کرتے رہتے ہیں۔ ہندوستان میں آگرہ ان کا بڑا مرکز تھا۔ اور وہاں سے ایک اردو رسالہ "کوکب" بھی شائع ہوتا تھا۔ اسی طرح دہلی میں ان کے ایک ہال سے اردو اور ہندی میں رسالے اور کتابچے شائع ہوتے تھے نہ جانے اب بھی شائع ہوتے ہیں یا نہیں۔ پاکستان کے سب سے بڑے شہر

کراچی میں بزنس ریکارڈر روڈ پر بہائی ہال موجود ہے۔ در و دیوار پر ۱۹ کا مقدس عدد لکھا ہوا ہے۔

عدد (۱۹) کے تقدس کی دلیل بہت دلچسپ ہے۔ بانی مذہب کا بانی علی محمد باب ۱۸۱۹ء میں شہر شیراز کے ایک شیعہ گھرانے میں پیدا ہوا تھا۔ اگر اس سنہ کے چاروں اعداد کو جمع کیجئے تو اس کل جمع ۱۹ ہوتا ہے۔ ۱+۸+۱+۹ = ۱۹ اس لئے عدد ۱۹ مقدس ہے۔ اب انہوں نے مسلمانوں میں تبلیغی کام کرنے کے لئے اس عدد کو قرآن مجید کی ریاضیاتی بنیاد بنا کر اس کا چرچا بڑے پیمانہ پر شروع کر رکھا ہے۔

علی محمد باب نے پہلے یہ دعویٰ کیا کہ امام غائب مہدی تک پہنچنے کا وہ باب یعنی دروازہ ہے۔ شیعوں میں ایک شخص نے پہلے بھی یہ دعویٰ کیا تھا اور ۷۵ یا ۷۸ سال تک وہ نائب الامام بلکہ باب الامام بنا رہا تھا۔ یہ زمانہ شیعوں میں غیبوبت صغریٰ کا زمانہ کہلاتا ہے جو ۳۲۵ھ یا ۳۲۹ھ میں ختم ہوا اور امام غائب حضرت امام مہدی کی غیبوبت کبریٰ کا زمانہ شروع ہوا جو شیعہ عقائد کے موجب قیامت سے پہلے حضرت امام مہدی کے ظہور پر ختم ہوگا۔

علی محمد باب نے شیعوں کے اس عقیدہ سے فائدہ اٹھاتے ہوئے باب الامام ہونے کا دعویٰ کیا۔ پھر جلد ہی ترقی کرکے باب اللہ یعنی اللہ تک پہنچنے کا دروازہ بن گیا۔ اس نے قرآن مجید کے مقابلہ میں ایک کتاب "البیان" لکھی۔ جسے الہامی کتاب قرار دیا۔ بلکہ قرآن مجید کے لئے اس کتاب کو ناسخ کہا۔ جب اس کے مریدوں کی تعداد کافی ہو گئی تو اس نے سیاسی قوت حاصل کرنے کی جدوجہد شروع کر دی۔ اب ایرانی حکومت کو ہوش آیا اور اس نے ۱۸۵۰ء میں علی محمد باب اور اس کی حسین و فصیح اللسان مریدنی قرۃ العین زرین تاج کو قتل کر دیا۔ قرۃ العین جیسے مختلف صفاتی ناموں سے یاد کیا جاتا ہے۔ اور طاہرہ بھی کہا جاتا ہے۔ ایک معمولی درجہ کی تک بندی کرنے والی شاعرہ تھی۔ اس کی چند غزلیں اور نظمیں مشہور ہیں اور بمبئی میں ایک بار طبع ہو کر شائع بھی ہوئی تھیں۔ وہ اپنے امام علی محمد کے ظہور کا اعلان اس طرح کرتی ہے۔

اگر ان صنم زرہ ستم پے کشتن من بے گنہ
لقد استقام بسیفہ فلقد رضیت بما رضی
ہلہ لے گروہ اما میاں بکشید دولہ رامیاں
کہ ظہور دل بر ماعیان شدہ فاش زاہر بر ملا

۱۸۵۰ء میں علی محمد باب اور قرۃ العین کے قتل کئے جانے کے بعد بابی مذہب کے لوگ تین فرقوں میں تقسیم ہو گئے۔ ایک فرقہ تو وہ رہا جو علی محمد باب کو عین ذات الہٰی کا ظہور مانتا رہا اور منتظر رہا کہ وہ پھر اس دنیا میں عنقریب آجائیگا۔ دوسرا فرقہ علی محمد باب کے اقرب حواری یحییٰ کو ظہورِ الہٰی تسلیم کر کے اس کے ساتھ ہو لیا۔ تیسرا فرقہ یحییٰ کے چھوٹے بھائی حسین نوری کا مرید ہو گیا۔ اور یہ عقیدہ قائم کیا کہ خدائے لم یزل و لایزال حسین نوری کی صورت میں جلوہ گر ہے۔ یحییٰ نے لقب نور ازل اختیار کیا اور حسین نے اپنے لئے بہاؤ اللہ نوری کا لقب پسند فرمایا۔ اسی طرح پیروان علی محمد باب تین ناموں سے موسوم ہوئے۔ بابی۔ ازلی۔ اور بہائی شاہان ایران نے چونکہ علی محمد باب اور اس کے مریدوں کو باغی قرار دے دیا تھا۔ اس لئے یہ فرقہ پردہ خفا میں چلا گیا۔ بیان کیا جاتا ہے کہ بابی اب بھی بہت تھوڑی تعداد میں شیراز کے قریب دیہاتوں میں موجود ہیں لیکن ان کی کوئی سرگرمی ظاہر نہیں ہوتی۔ یحییٰ نور ازل شیراز سے بھاگ کر عراق گیا اور وہاں سے پوشیدہ ہو کر جزیرۂ قبرص پہنچ گیا۔ اور جلد ہی اس کا انتقال ہو گیا۔ اس لئے فرقہ ازلیہ کچھ پھول پھل نہ سکا۔ تیسرا فرقہ بہائیہ خوب پھولا پھلا۔ بہاء اللہ کو ایران سے قید کر کے عراق پہنچا دیا گیا۔ اور وہاں حکومت برطانیہ کی خفیہ امداد سے یہ ترقی کرتا رہا۔ بہاء اللہ نے قرآن مجید کے مقابلہ میں ایک کتاب الاقدس کے نام سے بھی پیش کی اور اسے الہامی قرار دیا۔ تمام بہائی اس کتاب کو اللہ کی طرف سے نازل شدہ کتاب الہٰی سمجھتے ہیں۔

بہاء اللہ الابہیٰ مرزا حسین نوری کی وفات ۱۸۹۲ء میں بمقام عکہ (فلسطین) ہوئی۔ اسکی وفات کے بعد اس کے فرزند عبدالبہاؤ بہائیوں کے پیشوا اور ملہم من الغیب قرار پائے۔ ان کا نام عباس افندی تھا یہ اپنے والد کے بعد ان تمام صفات الہامیہ کے جامع

پیشوا ہوئے ۔ پھر ۱۹۳۶ء میں عباس آفندی کے فرزند شوقی یک اس مرتبہ پر فائز ہوئے ۔ پھر جب وہ بھی وفات پاگئے تو ایک مجلس قائم کی گئی، یہ سلسلہ اب تک جاری ہے ۔ فلسطین میں مقام عکہ کے قریب ایک میل کے فاصلہ پر ان کا صدر مقام ہے اور ساری دنیا میں بہائی ہالوں کے ذریعہ ان کی تبلیغی مہم جاری ہے یہودیوں کی حکومت اسرائیل اور یورپ و امریکہ ان کی حامی اور مددگار ہیں ۔

بہائیوں نے خود اعلان کر دیا ہے کہ انہیں مسلمانوں میں شمار نہ کیا جائے وہ نہ مسلمان ہیں اور نہ مسلمان ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں ۔ عقیدۃً وہ تمام مذاہب کو حق کہتے ہیں اور عملاً وہ کسی مذہب کے پابند نہیں ہے ۔ ایک بار ان کے متعلق ایک سوال رابطۂ عالم اسلامی مکہ مکرمہ کی مجلس فقہ المجمع الفقہی میں آیا تھا ہم سب ارکان نے طویل تحقیق کے بعد یہ فیصلہ کر کے اعلان کر دیا کہ بہائی کسی معنی میں مسلمان شمار نہیں کئے جا سکتے ۔ نہ ان کو مناکحات و عبادات میں مسلمان سمجھا جا سکتا ہے اور نہ معاملات و متفرقات میں ۔ یہ لوگ کفار اور اعدائے اسلام ہیں ۔ یہ لوگ خود بھی اپنے آپ کو مسلمان نہیں کہتے تو ان سے تعلقات اسلامی کیسے قائم ہو سکتے ہیں ۔

مندرجہ بالا چند سطور سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ :

۱ ۔ قرآن مجید کے لئے ایک ریاضیاتی بنیاد اور اس کے لئے عدد (۱۹) کی تعین بہائیوں کی مہم ہے ۔ ورنہ ان کا کوئی تعلق قرآن مجید سے نہیں ہے ۔ ان کا مقصد محض مسلمانوں میں عدد (۱۹) کی اہمیت کا احساس پیدا کرنا ہے ۔ تاکہ علی محمد باب کی برتری کو ذہن نشین کرایا جا سکے ۔

۲ ۔ عدد (۱۹) سے قدیم دیومالاؤں میں اوہام وابستہ تھے اور مختلف اعداد سے آج بھی مختلف اقوام کے اوہام وابستہ ہیں ۔ اتفاق سے علی محمد باب کی پیدائش کا سال موجودہ گریگوری کلینڈر سے ۱۸۱۹ء تھا ۔ اس کے اعداد کی جمع (۱۹) ہوتی ہے ۔ اس لئے اس عدد کی برتری اور اس کے تقدس کا عقیدہ بہائیوں میں موجود تھا ۔ انہوں نے قدیم دیومالاؤں سے یہ خیال اخذ کیا ہے اور پوری قوت سے اس

کا چرچا کر رہے ہیں تاکہ مسلمانوں میں بھی یہ خیال پیدا ہو جائے۔

۳ - قرآن مجید میں اور بہت سے اعداد کا ذکر موجود ہے۔ لیکن سب کو چھوڑ کر عدد (۱۹) کو قرآن مجید کی ریاضیاتی بنیاد بتانا قرآن مجید سے عقیدت کی وجہ سے نہیں ہے بلکہ علی محمد باب کے عین ذات الٰہی ہونے کے عقیدہ سے وابستہ ہے۔ یہ مہم اسرائیل اور دیگر اعدائے اسلام کی امداد سے چلائی جا رہی ہے۔ قرآن مجید کی برتری ثابت کرنے کے لئے نہیں چلائی جا رہی ہے۔ ہاں دعویٰ یہی کیا جاتا ہے ورنہ مسلمان اس مہم کی طرف کوئی توجہ نہیں کرتے۔

اب ذرا ریاضیاتی بنیاد ہونے کو خالص علمی انداز سے دیکھئے۔ کون کہہ رہا ہے اور کیوں کہہ رہا ہے۔ ذرا دیر کے لئے ان دونوں سوالوں سے قطع نظر کر کے صرف یہ دیکھئے کہ "کیا کہہ رہا ہے؟" آپ دیکھیں گے جو کچھ کہا جا رہا ہے وہ علمی حیثیت سے بالکل بے بنیاد سی بات ہے۔ مغالطہ ہے یا محض لاعلمی۔

(الف) بسم اللہ الرحمٰن الرحیم میں (۱۹) حروف نہیں بلکہ (۲۱) حروف ہیں۔ باسم اللہ الرحمان الرحیم۔ جو طرز کتابت کی وجہ سے بہ ظاہر (۱۹) دکھائی دیتے ہیں لفظ اسم کا الف خاص طرز کتابت کی وجہ سے نہیں لکھا جاتا ہے۔ ورنہ قرآن مجید ہی میں اقرأ باسم ربك اور سبح باسم ربك میں الف موجود ہے۔ اگر یہ تسلیم کر لیا جائے کہ الف بسم اللہ میں موجود ہی نہیں ہے۔ تو مادہ ب، س، م رہ جائے گا۔ جس کے معنی "بے آواز ہنسا" ہے۔ اسی طرح الرحمٰن کا وزن فعلان ہے جیسے سعدان، حیران اور غفران وغیرہ

مشتقات آتے ہیں۔ اور قرآن مجید میں اور عام طور پر عربی طرز کتابت میں جب الف کی آواز کو طویل انداز میں ادا کرنا مقصود نہ ہو تو الف کی بجائے کھڑا زبر لگا دیا جاتا ہے۔ قرآن مجید کے نسخوں میں خصوصاً ان مصاحف میں جو عرب یا ترکی میں لکھے یا طبع کئے گئے ہیں۔ دیکھئے سینکڑوں آیات میں نظر آئے گا کہ جہاں روایات تجوید و قرأت کے بموجب الف کی طویل آواز نہیں مقصود ہوتی وہاں الف ساکن کی جگہ ایک کھڑا زبر لگا دیا جاتا ہے۔ شمار میں الف ہی شمار ہوتا ہے یہی تحریری صورت بسم اللہ الرحمٰن الرحیم میں بھی ہے۔ بسم اللہ کے حروف کی تعداد

(۱۹) نہیں بلکہ (۲۱) ہے۔ ایک ہی سورۃ المائدہ ہی کی ابتدائی چند آیتوں کو غور سے دیکھئے آیت ۴ میں اَلطَّیِّبٰتُ، آیت ۵ میں الکتٰبُ، المحصنٰتُ المؤمنٰت الخٰسرین، آیت ۶ میں لٰمَسْتُمُ، آیت ۹ میں الصّٰلحٰت، آیت ۱۰ میں اصحٰب اسی طرح الف کی بجائے کھڑے زبر کے ساتھ ملیں گے۔ اوّلین سورۃ قرآنی یعنی سورۃ الفاتحہ میں لفظ مٰلک میم اور الف کے ساتھ نہیں بلکہ کھڑے زبر کے ساتھ ہی ملے گا۔

اگر ان ساری آیتوں میں الفاظ میں سے الف خارج از شمار کر دیئے جائیں تو کیا یہ معانی قائم رہ سکتے ہیں۔؟ بالکل یہی صورت لفظ الرحمٰن کی ہے۔ اگر اس کے کھڑے زبر کو الف نہ شمار کیا جائے تو مادہ رحم سے فَعْلَنْ ایک مشتق شمار کرنا پڑے گا۔ عربی زبان اس جدید وزن سے واقف نہیں ہے۔

میں یہ تو نہیں کہہ سکتا کہ اس قسم کی دلیلیں پیش کرنے والے اتنے جاہل ہیں کہ ناظرہ قرآن مجید بھی نہیں پڑھ سکتے۔ لیکن یہ صاف نظر آتا ہے کہ یہ ارادی طور پر مغالطہ اور ابلہ فریبی ہے۔ اس میں بہائیوں کی ذہانت کا کوئی عمل نہیں ہے بلکہ دوسری صدی ہجری کے اواخر میں جاہل عجمیوں پر اپنی خدارسیدگی کا رعب جمانے کے لئے مدعی نبوت بابک خرمی نے جہاں اور بہت سی عجیب باتیں پھیلائی تھیں ایک جعلی روایت بنا کر حضرت عبداللہ بن مسعود کی طرف یہ قول منسوب کر دیا تھا کہ بسم اللہ کے (۱۹) حروف ہیں۔ یہ روایت ابن کثیر نے سورۃ [illegible] کی تفسیر میں بغیر تصحیح نقل کی ہے۔ اسی روایت کو دیکھ کر بہائیوں نے بسم اللہ کے انیس حروف کا چرچا کیا ہے۔

اب ان کی دوسری دلیل کو دیکھئے۔ یہ دعویٰ کیا گیا ہے۔ سورۃ الاعراف (۷) میں حرف "ص" کی اتنی تعداد ہے جو (۱۹) پر تقسیم ہو جاتی ہے۔ اس دعویٰ کے لئے سورۃ الاعراف کی آیت ۶۸ میں جو لفظ بسطۃ پر حرف "ص" بنا دیا جاتا ہے۔ اس کو بھی شمار میں لیا گیا ہے۔ ہر عربی دان جانتا ہے کہ عربی زبان میں بسط کوئی مادہ ہی نہیں ہے۔ سورہ البقرہ کی آیت ۲۴۷ اور سورۃ الاعراف کی آیت ۶۸ میں جو ص ہے وہ صرف اس لئے ہے کہ قراء نے اس جگہ بسطۃ کی سین کو مفخم آواز میں ادا کیا ہے۔ ورنہ ظاہر ہے کہ جب عربی زبان میں ب س

لے کوئی مادہ ہی نہیں ہے تو بستہ میں درس ،، کہاں سے آ جاتے گا۔ یہ کس قدر دلچسپ ابلہ فریبی ہے۔ اور اگر ابلہ فریبی نہیں تو کیسی مضحکہ خیز نادانی وجہالت ہے۔

اسی طرح عدد (۱۹) کو قرآن مجید کی ریاضیاتی بنیاد بتلانے والے عددی مغالطے دیتے ہیں اور ضرب و تقسیم کا عمل کرکے ہر جگہ ۱۹ کو حاصل جمع اور مقسوم علیہ ثابت کرتے ہیں اور دعویٰ یہ ہے کہ کمپوٹر نے امریکہ میں یہ بنیاد ثابت کی ہے ورنہ اس سے پہلے قرآن مجید کے اس ریاضیاتی بنیاد کی خبر نہ صاحب وحی صلی اللہ علیہ وسلم کو تھی اور نہ کسی صحابی کو اور عہد سعادت سے لے کر اب تک کسی کو اطلاع نہ ہو سکی کس ذی ہوش کو اس کا یقین آتے گا۔ کہ قرآن مجید کی ایک ریاضیاتی بنیاد ہے اور اس سے سب ہی ناواقف رہے کمپوٹر دیتے ہوتے اعداد پر صحت کے ساتھ حسابی عمل تو کر دیتا ہے لیکن یہ تو کسی کے لئے قابل قبول نہیں ہو سکتا کہ کمپوٹر کسی عدد کو تقدس اور مہتم بالشان بنا کر پیش کر دے۔

اس طرح جمع، تفریق اور ضرب و تقسیم کے ذریعہ بیسیوں عددی عجائبات قرآن مجید میں بلکہ معمولی انسانی تصنیفات میں پیدا کئے جا سکتے ہیں۔ مثلاً حٰمٓ کے اعداد جمل (۴۸) کو اگر سورۃ الحاقہ آیت ۱۷ میں بیان کئے ہوتے عدد ملائکہ حاملان عرش (۸) پر تقسیم کیا جائے تو چھ کا عدد برآمد ہوگا۔ اور حٰمٓ چھ سورتوں کی ابتدا میں ہے۔ قرآن مجید میں ۲۹ سورتوں پر حروف تہجی بطور حروف مقطعات موجود ہیں اور یہ ۱۴ مجموعات ہیں۔ ۱۴ کو ۱۴ پر ضرب دیجئے۔ ۱۴ x ۱۴ = ۱۹۶ پھر ان اعداد کو اصحاب کہف کے عدد (۷) پر تقسیم کیجئے تو چاند کے ۲۸ لمعات کا شمار مل جائے گا۔ اس طرح جتنے عجائبات عدد چاہیں قرآن مجید ہی نہیں بلکہ کسی کتاب سے برآمد کئے جا سکتے ہیں۔ طلسم ہوشربا سے فسانہ عجائب سے، گلستاں و بوستاں سے ایسے بہت سے عجائبات برآمد کر لیں۔

کیسی عجیب ابلہ فریبی ہے کہ اس قسم کے حسابی اور عددی عجائبات کو قرآن مجید کا معجزہ بنا کر پیش کیا جاتے۔ آدمی طبعاً عجائب پسند ہوتا ہے۔ ہر بات پر اپنی ذہنی قوت صرف نہیں کیا کرتا۔ اس لئے اچھے خاصے ذی ہوش اور تعلیم یافتہ لوگ بھی ایسی باتوں کی طرف متوجہ ہو جاتے ہیں اور ابلہ فریبی کے چکر میں پھنس جاتے ہیں

اَللّٰھم اخرجنا من ظلمات الوھم واکرمنا بنور الفھم
وثبت اقدامنا علی صراطك المستقیم۔

of the Holy Quran whose preservation and protection Allah has taken upon Himself: "Surely, We have sent down this Message, and surely We will preserve it." (15:9); "Falsehood cannot come at it from before it or behind it. (It is) a Revelation from the Wise, the Owner of Praise." (41:42); "And recite that which hath been revealed unto thee of the Scripture of thy Lord. There is none who can change His words, and thou wilt find no refuge besides Him." (18: 28).

We end this artricle with the grave warning given by the Quran to people like Khalifa and Deedat.

"THEY THINK TO BEGUILE ALLAH AND THOSE WHO BELIEVE, AND THEY BEGUILE NONE SAVE THEMSELVES, BUT THEY PERCEIVE NOT." (2:9)

Dr. Rashad Khalifa, the originator of the theory of No. 19, has once again, like a cobra, raised his head – but this time to attack the very foundation of Allah's Word.

بقیہ:۔ 'حکمتِ اقبال'

افعال آشکار ہوتے ہیں بالکل اسی طرح سے ذاتِ حق ایک ہے لیکن کائنات کی کثرت میں اس کا ظہور ہوا ہے پھر وہ مخفی ہے لیکن کائنات کی تخلیق نے اُسے آشکار بنا دیا ہے گویا انسانی انا کی فطرت خدا کی فطرت کی طرف راہ نمائی کرنے والی ہے۔

ایں پستی و بالائی ایں گنبدِ مینائی — گنجد بدلِ عاشق با ایں ہمہ پنہائی
اسرارِ ازل جوئی برخود نظرے وا کن — یکتائی و بسیاری پنہائی و پیدائی

اقبال

AL-ARSH: This word appears in the Quran no less than 22 times and not 19 or 20 times as claimed by Khalifa.

Obviously Dr. Khalifa's computer needs to brush up its arithmetic!

We consider it instructive to give below Surah and verse numbers for the readers to check for themselves: 7:45; 9:129; 10:3; 12:100; 13:2 17:42; 20:5; 21:22; 23:86; 23:116; 25:59; 27:23; 32:4; 39:75; 40:7; 40:15; 43:82; 57:4; 69:17; 81:20 and 85:15. (It may interest readers to know that we have not included this word which appears in a slightly different form in several more places).

Readers can easily check the numbers for themselves and find out how they have been deceived!

(EDITORIAL NOTE: From the very beginning when this Bhai theory of 19 was first propounded by Dr. Rashad Khalifa, AL-BALAAGH had fought it tooth and nail. Our simple logic was that Allah's Word does NOT need a mathematical buttressing and bolstering. If non-Muslims wish to accept Islam and believe in the Quran, then they must do so on the impregnable integrity, awe-inspring beauty and compelling appeal of the Quran per se. . . and NOT because of some spurious mathematical computation revolving around the number 19!

The computer-crazy, mixed-up "whiz-kid"-scholars have to this day, not answered this question posed by us in 1981!!

IGNORANCE

In passing, we would like to expose Khalifa's ignorance of even an ordinary historical fact. In his MUSLIM PERSPECTIVE (April 1985) he says:" . . . Omar was an intimate friend of the Prophet from early Islam, a son-in-law of the Prophet, the second Khalifa. . ." It is very strange that Mr. Deedat's "great servant of Islam" is not even aware of the fact that Hazrat Umar (R) was the FATHER-IN-LAW of the Prophet (S), and NOT his "son-in-law". And yet this "great servant of Islam" has the temerity and the audacity to question the integrity

CONCORDANCE

It seems that everybody has been overawed by the mention of computers. It never occurred to anyone to look into a concordance of the Holy Quran and just count the number of times a certain word, e.g. RAHMAN, occurs.

Without using any computer – for we do not need any – but with the aid of the concordance of the Quran, we shall check the number of times the words AL-LAH, RAHMAN, RAHEEM and ARSH occur in the Quran.

Khalifa, is not aware of the fact th at BISMILLAHIR RAHMAANIR RAHEEM is not only sacrosanct beginning and mark of distinction between different surahs, but is also an important constituent and integral part of Surah Fatihah and all other Surahs of the Quran!

Ibn Abbaas is on record to have said that whenever a new Surah was revealed to the Holy Prophet (S), "BISMILLAAHIR RAHMAANIR RAHEEM" was the FIRST verse to be revealed. Our computer obsessed scholars have very conveniently ignored. "Bismillah" appearing at the beginning of the 112 Surahs, but have merely taken into account only the one at the beginning of Surah Fatihah, when they counted the words ALLAH, RAHMAN and RAHEEM. Are the BISMILLAHS at the beginning of the 112 Surahs not part of the Quranic text? By ignoring the 112 BISMILLAHS, Khalifa and Deedat are guilty of TAMPERING with the Quranic text!

EVIDENCE

We shall now examine the evidence with the aid of an English concordance by Hanna E. Kassis and an Arabic concordance by Muhammad Fu'ad Abdul Baqi.

ALLAH: The number of times the word ALLAH appears is not 2698 (as Khalifa previously said) or 2699 (as Khalifa has now come up with), but 2811!

RAHEEM: The word RAHEEM does not occur 114 or 115 times, as we are led to believe, but no less than 227 times!

RAHMAN does not appear 57 times as stated by Khalifa but 169 times!

"Nine violations of the Quran's mathematical code were discovered by the time the review of data was completed. ALL NINE VIOLATIONS HAVE BEEN FOUND IN THE LAST TWO VERSES OF SURAH 9. (See the Table at the end of this article)."

The table referred to in the above quotation is hereunder:

VIOLATIONS OF THE QUR'AN's MATHEMATICAL MIRACLE

VIOLATED WORD		Frequency in Qur'an Without Removal of 9:128 and 129	Frequency in Qur'an After Removel of 9:128 and 129	
Messenger	رسول	115	114	(19x6)
(your) selves	أنفس	153	152	(19x8)
Merciful	رحيم	115	114	(19x6)
Turn away	تولوا	20	19	(19x1)
God	الله	2699	2698	(19x142)
god	الله	96	95	(19x5)
Trust		58	57	(19x3)
Lord	رب	970	969	(19x51)
Throne	العرش	20	19	(19x1)

The discrepancies are apparent from the figures given in the two columns. How is it that such simple figures could not be worked out, with the aid of a computer, in seventeen long years? Was his computer fed inaccurately in the first place? Was his computer out of order then, or is it out of order NOW? Will Dr. Khalifa's errant computer discover some more "tampering" with the Quran after another 17 years? The truth, however, is that: "This is the sickness of man, that when he fails to account for any happening, he invents a word through which he bluffs himself that he has answered the problem. He takes refuge behind a word!" ("AL-QURAN- THE ULTIMATE MIRACLE" by Ahmad Deedat, 1985 U.K. edition, p. 27; 1979 ed., p. 31)

That, indeed, is the sickness of Mr. Deedat's "great servant of Islam" – Rashad Khalifa. When he failed to account, through deliberate concealment, for the last two verses of Surah Taubah, he invented a lie (that he used computers) through which he tried to bluff others that he had answered the problem of the authenticity of the Holy Quran.

In his translation of the Quran, Khalifa writes: "The Quran's miraculous numerical code is so intricate that it leaves no doubt that the Quran is the Word of God, and that it has been perfectly protected from the slightest distortion, addition or loss." (QURAN: THE FINAL SCRIPTURE, Tucson, 1981, p. 1).

That is only one side. The other side is revealed in Khalifa's bulletin, MUSLIM PERSPECTIVE (March 1985). Unashamedly he reneges thus: "COMPUTER EXPOSES AN HISTORICAL CRIME TAMPERING WITH THE WORD OF GOD; TWO FALSE VERSES UNVEILED IN QURAN".

Rashad Khalifa stands exposed and condemned by his own writings. Mr. Deedat likewise! They are proved fabricators and prevaricators by their own contradictory statements. Another example of contradiction is contained in the March issue of his MUSLIM PERSPECTIVE where he affirms the result of his findings: "During the last 17 years (1968-1985), intensive research into the Quran with the use of computers has produced startling results, and an overwhelming proof of authenticity."

Again: "What concerns us in this Bulletin is the prominent physical fact that the opening verse of the Quran (BISMILLAH) consists of 19 letters, and every word in it is mentioned throughtout Quran a number of times which is CONSISTENTLY A MULTIPLE OF 19. Thus, the first word (Ism = Name) is found in Quran exactly 19 times; the second word (Allah = God) is mentioned 2698 times (19 x 142); the third word (Rahman = Gracious) is mentioned 57 times (19 x 3); and the last word (Raheem = Merciful) is mentioned 114 times (19 x 6), plus one time that refers specifically to the Prophet and is not an attribute of God."

But for some inexplicable reason, Rashad Khalifa feels the necessity of revising his seventeen years of hard labour: "During the last three years, an extensive study was undertaken to examine the mathematical miracle of the Quran at the word for word level. The objective was to confirm that the computers did not err, and that the results do conform to the Quran as it was originally recorded during the Prophet's lifetime. . . ."

In this "revision" he discovers not one but NINE errors! He tells us: "It is the result of this vast review of the computer data that unveiled the shocking crime of tampering with the Quran.

Mr. Arafaque Malik has also mentioned Mr. Ahmad Deedat as an ardent supporter of Rashad Khalifa. And no doubt, like many sincere, devout and orthodox Muslims, he has slavishly echoed Khalifa's ideas. I have, however, taken the liberty of omitting those lines from the article as Mr. Ahmad Deedat is generally held in high esteem in Islamic circles on account of his tremendous Da'wah activity and, in particular, his struggle to counter the ansloght of Christian missionaries against Islam. I pray that he may become aware of the refarious designs of Rashad Khalifa and renounce his theory forthwith. A highly scholarly and informative study written by Maulana Abdul Quddus Hashmi on the theory of Number 19 in respect of the Quran is being reproduced elsewhere in this issue to further englihten our readers on the subject. May Allah (S. W.T) save us all from the evil promptings of Satan and his acolites! Amen.

Absar Ahmad

Rashad Khalifa, inventor of the spurious theory of Number 19, cleverly camouflaged his hypocrisy and sinister designs by wearing the mask of a sincere Muslim. Having beguiled the Muslim community into believing in his new-fangled theory of 19, he is now gradually unmasking himself and revealing his true identity.

The first glimpse of Khalifa's hypocrisy came to light when he declared in his bulletin, MUSLIM PERSPECTIVE, of March 1985, that: "THE COMPUTER EXPOSES AN HISTORICAL CRIME; TAMPERING WITH THE WORD OF GOD; TWO FALSE VERSES UNVEILED IN QURAN; AN INVITATION TO ALL MUSLIMS TO EXAMINE THE EVIDENCE BEFORE REMOVING THE FALSEHOOD."

In the April 1985 issue of MUSLIM PERSPECTIVE, a bold subheading tells the Muslim world: "MORE EVIDENCE CONFIRMS THE FALSEHOOD OF THE LAST TWO VERSES OF SURAH 9".

VOLTE-FACE

Let us now see what Khalifa has been saying about the integrity of the Quran, before reneging upon it and making a complete volte-face. Rashad Khalifa, on the cover of his booklet, MIRACLE OF THE QURAN, says that the Quran "comes to us perfectly preserved". He further adds on Page 1 of the same booklet: "It has been protected throughout the times from the slightest distortion, addition or loss".

THE GREAT BRAIN ROBBERY

Theory of 19-a great hoax

by: Arfaque Mialk

EDITORIAL NOTE

The following article by Mr. Arfaque Malik is being published through teh courtesy of Brother Suhaib Hassan of London. He was kind enough to send me a copy of August/ Sept.'86 issue of "Al-Balagh", a magazine published from Johnesnburg, with the noble aim of expounding and preaching Islam in its pristine purity. This article first appeared in that magazine. I believe that the contents of this should be widely circulated in order to dispel the dangerous influence of the false theory of Number 19 with regard to the Holy Quran as first propounded by Dr. Rashad Khalifa of Tuscon, Arizona (USA). A few year ago I myself had an opportunity to meet Dr. Khalifa in Algiers (Algeria) in an International Conference on Islamic thought held there annually. I vividly remember that at that time he appeared to me a sincere and believing Muslim, though rather obsessed with his theory of the Number 19 which he presented as a most revolutionary discovery of this century. Educated in science (his Ph.D. is in Chemistry!), he turned to Islamic Studies and in particular to the Quran. As he was born in Egypt and received his early education there, he has the privilege of knowing Arabic as his mother language. At that time he worked as a full-time Director and Imam of Tuscon Islamic Centre/Mosque. But as things turned out later, perhaps his over-eagerness and ambition for recognition and authorship has clearly led him off the track. Now he has gone to the extent of questioning the verbal integrity of the Holy Quran which he himself vehemently held and championed during the early phase of his computer-based Quranic research project. This by itself in an internal incoherence in his thought and provides an adequate ground for repudiating the enntire theory.

تصانیف ڈاکٹر اسرار احمد

	اعلیٰ	اشاعتِ عام
مُسلمانوں پر قرآنِ مجید کے حقوق	6.00	2.00
راہِ نجات (سورۃ العصر کی روشنی میں)	5.00	2.00
قرآنِ حکیم کی سُورتوں کا اجمالی تجزیہ	10.00	
مطالعۂ قرآنِ حکیم کا منتخب نصاب	12.00	
قرآن اور امنِ عالم	2.00	
دعوت الی اللہ	2.00	
رسُولِ کامل ﷺ	6.00	
نبی اکرم ﷺ کا مقصدِ بعثت	5.00	3.00
نبی اکرم ﷺ سے ہمارے تعلق کی بنیادیں	4.00	
معراج النبی ﷺ	3.00	
شہیدِ مظلوم (حضرت عثمان ذوالنورین رضؓ)	5.00	2.00
سانحۂ کربلا (شہادت حسینؓ کا اصل پس منظر)	4 00	2.00
اسلام کی نشاۃِ ثانیہ کرنے کا اصل کام	2.00	
اسلام میں عورت کا مقام	8.00	5.00
عظمتِ صوم	2.00	
عید الاضحیٰ اور فلسفہ قربانی	4.00	
اسلام اور پاکستان	5.00	
استحکامِ پاکستان	30.00 20.00	
علامہ اقبال اور ہم	3.00	
شادی بیاہ کے ضمن میں ایک اصلاحی تحریک	4.00	
اسلام کا معاشی نظام	6.00	
دعوتِ رجوع الی القرآن		

Regd. L. No. 8193

'HIKMAT-E-QURAN' MONTHLY LAHORE

VOL. 6 | JANUARY 1987 | No. 1

مقابل ہے آئینہ

کراچی کی آگ کو بھڑکانے میں کس کس کا — کتنا کتنا حصّہ ہے ؟

سقوطِ مشرقی پاکستان کے پندرہ برس بعد — سندھ کیوں جل رہا ہے ؟

پنجابی سندھی کشمکش — مہاجر پٹھان تصادم کیوں بن گئی ؟

کیا اِس شر میں کچھ خیر بھی ہے ؟

سیاسی محرومیوں، انتظامی بے تدبیریوں، حکمرانوں کے آمرانہ طرزِ عمل، اپنوں کی مہربانیوں اور غیروں کی سازشوں کا — بے لاگ تجزیہ

اصلاحِ احوال کی مثبت تجاویز

امیر تنظیم اسلامی **ڈاکٹر اسرار احمد** کا تازہ سلسلۂ مضامین

استحکامِ پاکستان اور مسئلۂ سندھ

کتابی صورت میں دستیاب ہے

ہر دردمند پاکستانی کے لیے اِس کتاب کا مطالعہ ضروری ہے

ملنے کا پتہ : **انجمن خدّام القرآن** ۳۶ کے ماڈل ٹاؤن لاہور